ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اپریل ۲۰۰۱ء

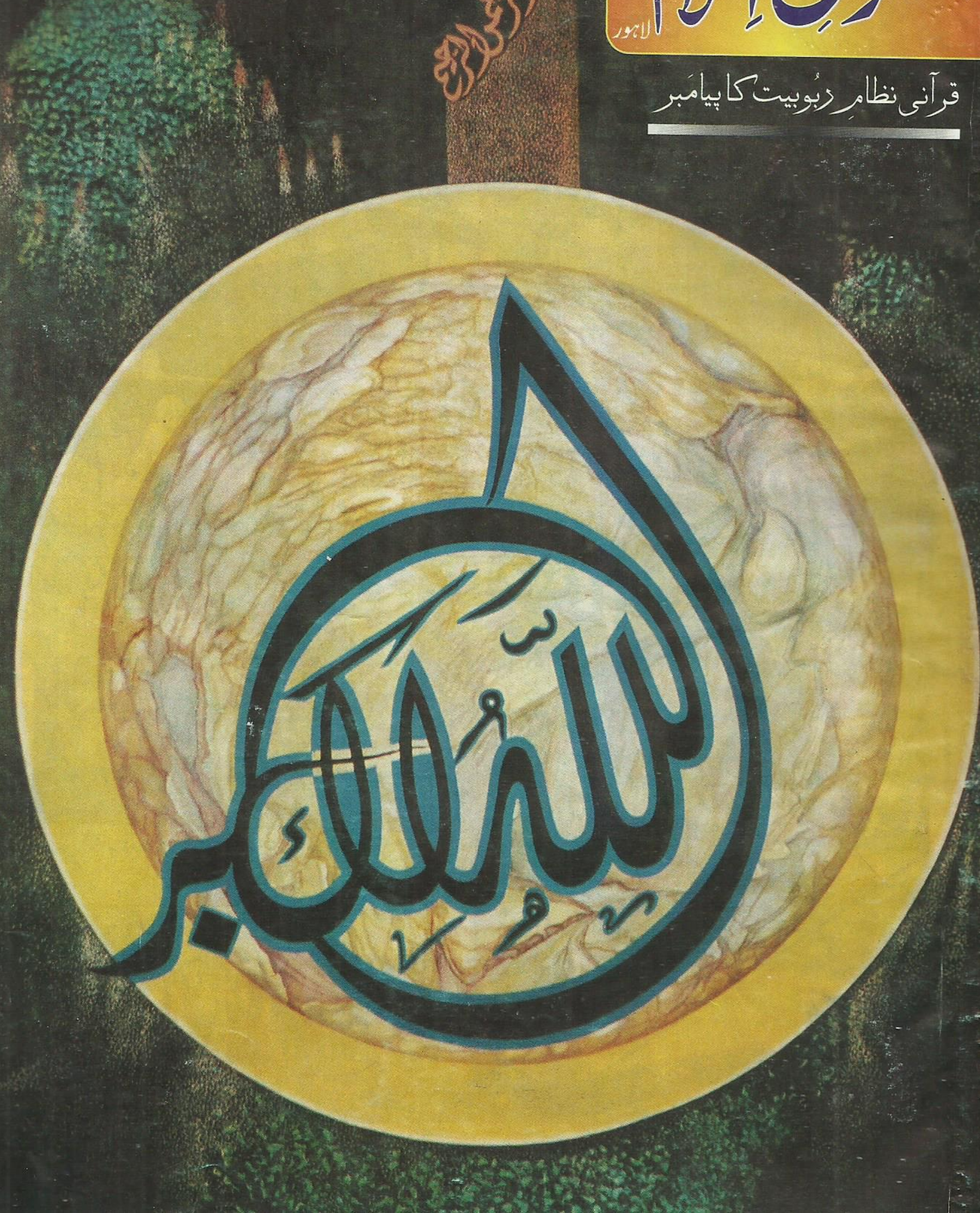

23 مارچ 2001ء

مینار پاکستان کے سایہ تلے طلوع اسلام کے اسٹالز کے مناظر

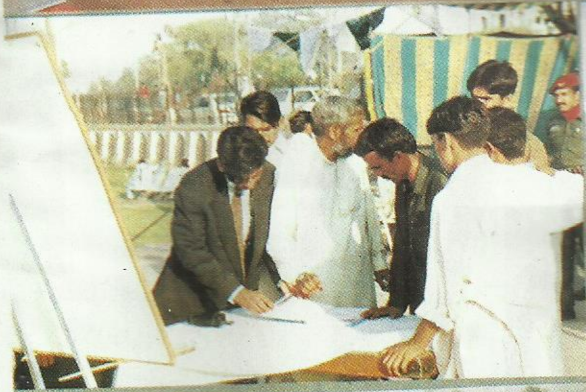

مجلہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا

قُرآنی نظامِ ربُوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
15/-
روپے

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵- بی گلبرگ ۲ لاہور- ۵۴۶۶۰
ٹیلی فون: 5714546-5753666
idara@toluislam.com

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان -/170 روپے
غیر ممالک -/800 روپے

Bank Account Number 3082-7 National Bank of Pakistan, Main Market Gulberg Branch, Lahore.

جلد 54 | اپریل 2001ء | شمارہ نمبر 04

ایڈیٹر

محمد سلیم اختر

مجلس مشاورت

✵ ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

✵ محترمہ شمیم انور

اکاؤنٹینٹ ---------- محمد زمرد بیگ

کمپوزر ---------- شعیب حسین

انتظامیہ

چیئرمین ---------- ایاز حسین انصاری

ناظم ---------- اقبال ادریس

ناشر ---------- عطاء الرحمان ارائیں

قانونی مشیر

◉ عبداللہ ثانی ایڈووکیٹ

◉ ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

◉ محمد اقبال چوہدری ایڈووکیٹ

پرنٹرز: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور- فون: 7232584

فہرست

لمعات

نماز استسقاء یا ٹھوس منصوبہ سازی؟	محمد سلیم اختر	3
جواہر ریزے (غلام احمد پرویز کی تحریروں سے انتخاب)	ثریا کوثر قیصرانی	5
محشرستان فلسطین (دوسری و آخری قسط)		7
لغات القرآن (ارض)	ادارہ	24
جماعت اسلامی کے بدلتے نظریات	محمد علی فارق	26
عید محکوماں، ہجوم مومنین	حسنین سعید ایڈووکیٹ	34
ایک اہم کانفرنس کا ذکر	ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان	37
ماسکو سے ایک پیغام	سام جیران / ترجمہ عبدالغفور محسن	41
روداد بسلسلہ تقریب ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء	محمد سلیم اختر	44
سرورق کے مصور	محمد علی برکت	

ENGLISH

The Time Factor
BY SHAMIM ANWAR 49
Social Justice In Islam
BY A.RASHID SAMNAKAY 52
The Status of Hadith
TRANSLATED BY ABOO B. RANA 64

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نماز استسقاء یا ٹھوس منصوبہ سازی؟

زراعت کا شعبہ ہمارے ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے اور زراعت کی بقاء کا انحصار پانی کی فراوانی پر ہے۔ قدرت نے دریائے سندھ کی صورت میں ہمیں لازوال نعمت سے نوازا ہے اور اس قدر آبی وسائل دیے ہیں کہ ان کے صحیح استعمال سے سرسبزیاں اور شادابیاں مملکت خداداد پاکستان کا مقدر بن سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام موجود ہے جس کے تحت ۳۸ ہزار میل طویل، چھوٹی بڑی نہریں ۲۰ بیراجوں سے نکلتی ہیں، جو تین کروڑ ساٹھ لاکھ ایکڑ رقبہ کو سیراب کرتی ہیں۔ یہ بھی قدرت کا کتنا بڑا احسان ہے کہ دریائے سندھ جب پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتا ہے تو اس کی بلندی آٹھ ہزار فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ وہ کوہ ہمالیہ سے رم خوردہ گزرتا ہوا جب میدانی علاقے میں خرام کرتا ہے تو اس کی بلندی صرف چھ سات سو فٹ رہ جاتی ہے۔ سات ہزار فٹ کا یہ نشیب پن بجلی پیدا کرنے کا ایک قدرتی تحفہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دریاؤں کو اپنے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ کر انسان کے لئے اس لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ اس سے نہ صرف آب پاشی کا کام لے بلکہ برقی توانائی جیسے دیگر فوائد بھی حاصل کرے۔ وسخر لکم الانھار القرآن ۱۴/۳۲۔ لیکن انسان اپنے رب کے عطا کردہ انعام و اکرام سے انکار کر کے ظلم کا ارتکاب کرتا ہے۔ کان الانسان لظلوما کفارا ۱۴/۳۴۔ جن قوموں نے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر ان سے استفادہ کیا وہ آج

خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ دریائے نیل پر مصر نے ڈیلٹا کے مسائل کے باوجود سوان ڈیم تعمیر کیا تو اس کی زراعت میں واضح مثبت تبدیلی رونما ہوئی' سوڈان کی حکومت نے دریائے نیل سے اپنی زمین سیراب کرنے کی تدبیر کی تو عوام کی زندگیوں میں شادابیوں اور خوشگواریوں کا اضافہ ہوا۔ مگر وہ افریقی ممالک جو اس دریا کا پانی ضائع کرتے رہے وہ گذشتہ ۲۰ سالوں سے شدید قحط زدگی کا شکار ہیں۔ امریکہ نے ۵۰ سال پہلے اپنی ضرورت سے دوگنے ڈیم تعمیر کر لئے تھے اب اسے ۳۰۰ سو سال تک آبی ذخائر سے متعلق فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر حیف ہے ہم پر کہ قرآن جیسی کتاب مبین کے حاملین کہلاتے ہیں اور پانی جیسا قیمتی اثاثہ' جو زمین مردہ کو حیات نو بخشتا ہے' فاحیا به الارض بعد موتها۔ (القرآن ۴۹/۲۵' ۶۵/۱۶' ۲/۱۶۴) ہر سال ہماری آنکھوں کے سامنے لاکھوں کروڑوں ایکڑ فٹ کی مقدار میں بہہ کر سمندر میں چلا جاتا ہے اور ہم ہیں کہ باہمی عدم اعتمادی کے باعث اس نعمت گراں مایہ کو بروئے کار لانے سے قاصر چلے آ رہے ہیں۔ ان الله لذو فضل على الناس ولكن اكثرهم لا يشكرون ۱۰/۶۰۔

حالات کی سنگینی کا تقاضا ہے کہ ملک بھر کے وسیع تر قومی مفاد میں متبادل آبی وسائل کے حصول کا از سر نو جائزہ لیا جائے تاکہ وطن عزیز اِن ناگزیر آبی وسائل کا بندوبست کرنے کی راہ پر گامزن ہو سکے جس میں پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ اگر صورت حال جوں کی توں رہی تو یہ مملکت آئندہ چند سالوں میں قانونِ مکافاتِ عمل (جو عمل کرو گے وہی اس کا بدلہ ہو گا) (القرآن ۷/۶۶' ۷/۱۴۷' ۲۷/۹۰) کی رو سے پانی کے قحط کی ایسی صورت حالات سے دوچار ہو جائے گی جس سے مفر ممکن نہیں ہو گا۔

اب ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے کہ ہر سال نماز استسقاء ہی پڑھتے رہنا ہے یا قوانینِ خداوندی کی رو سے ٹھوس منصوبہ بندی کر کے اس پیاس کے عذاب اور پانی کے قحط کا سدِّ باب کرنا ہے اور مملکتِ خداداد پاکستان کو جنت مثال بنانا ہے۔ جنت گھنے باغ کو کہتے ہیں۔ ایسے باغات جو ہمیشہ سیراب رہتے ہیں اور ہمیشہ ثمر بار۔ ان کے نیچے آبِ رواں مسلسل بہتا ہے۔

مثل الجنته التى وعد المتقون۔ تجرى من تحتها الانهر
(القرآن ۱۳/۳۵)

محمد سلیم اختر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثریا کوثر قیصرانی

جواہر ریزے

(غلام احمد پرویز کی تحریروں سے انتخاب)

☆☆ انسانی نظام خارج سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام دل کی گہرائیوں سے ابھر کر سامنے باہر آتا ہے۔

☆☆ سوچئے کہ زندگی کیا ہے؟

یہ وقت کے لمحات کے تسلسل ہی کا تو نام ہے۔ وقت کی اہمیت کے احساس کے نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی کی کوئی اہمیت نہیں اور جب زندگی کی اہمیت ختم ہو جائے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆ غلط پٹری پر پڑی ہوئی گاڑی کی رفتار میں جس قدر تیزی پیدا کی جائے' وہ اتنی ہی سرعت سے منزلِ مقصود سے دور لے جائے گی۔

☆☆ اگر مقصد کو ذرائع سے الگ کر لیا جائے تو وہ عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا' محض دکھاوا رہ جاتا ہے۔

☆☆ حق و صداقت کی زندگی اس وقت بسر ہو سکتی ہے جب انسان میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ جب تک دل نہ بدلے انسان کی روش نہیں بدل سکتی۔

☆☆ شرک کا نتیجہ خوف' اور خوف کا نتیجہ وہ جہنم کی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔

☆☆ چونکہ منافقین کے قول اور فعل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اس لئے ان کے ساتھ دوستدارانہ تعلقات وابستہ نہیں کئے جا سکتے۔

☆☆ جس طرح تانت اور کمان کے الگ الگ رہنے سے روئی نہیں دھنی جا سکتی' اسی طرح جب تک تمہاری ظاہری نقل و حرکت کے ساتھ نیک نیتی شامل نہ ہو' کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔

☆☆ جو قومیں' مستبد حکمرانوں کے سامنے اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں' ان (حکمرانوں) کی ہستی غبارِ راہ کی طرح فضا میں گم ہو جاتی ہے اور تاریخ میں صرف ان کے مظالم کی داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کی خدائی' محکوموں کی غلامانہ روش کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

☆☆ دین میں شعائر اور ''عبادات'' ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مذہب میں اِن کی ادائیگی مقصود بالذات بن جاتی ہے۔

☆☆ روشنی کا خاصا ہے کہ اپنے تعارف اور نمود کے لئے کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں ہوتی۔۔ روشن چراغ کو دوسرے دیئے کی روشنی سے تلاش نہیں کیا جاتا۔ اس کی اپنی روشنی دیکھنے والے کو خود بخود اپنی طرف لے آتی ہے۔ نیز وہ ہر شئے کا صحیح صحیح مقام متعین کر دیتی ہے اور بتا دیتی ہے کہ وہ کیا ہے۔۔۔ یہی کیفیت قرآن کی ہے۔

☆☆ منافقین کے لئے ''مذبذبین'' کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ اس کا مادہ (ذ۔ب۔ب) ہے جس کے معنی مکھی کے ہیں۔ آپ کسی مکھی کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھئے۔ اسے کسی ایک جگہ قرار نہیں ہوتا۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ پھر آپ اس کے متعلق کہہ ہی نہیں سکتے کہ وہ جہاں بیٹھی ہے وہاں سے اڑ کر کہاں بیٹھے گی۔ اس قسم کی حالت منافقوں کی ہوتی ہے۔ اس لئے وہ سخت ناقابل اعتماد ہوتے ہیں۔

☆☆ قرآنِ کریم نے اپنی تعلیم، پیغام، راہ نمائی کو مکمل طور پر واضح کر دینے کے بعد آخری دو آیات میں چند ایک شرور سے محتاط رہنے کی تاکید کی ہے۔ ایک ''حسد کرنے والے کے حسد سے'' اور دوسرے ''وسوسہ انگیز (جھوٹا پراپیگنڈہ اور سرگوشیاں) کرنے والے کے شر سے''۔ اور اس پر اپنی کتاب کا اختتام کر دیا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ حسد اور وساوس انگیزیاں کس قدر خطرناک ہیں اور اِن کی پیدا کردہ تباہ کاریاں کس قدر مہیب۔۔!

☆☆ قابلِ اعتماد وہی انسان ہوتا ہے جو اصول پرست ہو۔ لیکن اس کے برعکس جذبات (مفاد) پرست انسان پر بھروسہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔

☆☆ ۔ خیانت کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس سے اُسے کچھ مل گیا ہے، حالانکہ، اِس سے اُس کی انسانی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

☆☆ جس شخص میں خود اعتمادی نہ ہو، اس پر دوسرے کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟

☆☆ ایمان قرآنِ کریم کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین کا نام ہے۔

☆☆ تضحیک، استہزاء۔۔ شرفِ انسانیت سے گری ہوئی خصلتیں ہیں۔ اس لئے ان کے ارتکاب سے انسان خود اپنے مقامِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ لہٰذا ان سے اجتناب خود اپنی شرافت کا ثبوت ہے۔

☆☆ جب کسی قوم کی ذہنیت بگڑتی ہے تو سب سے الم انگیز اور رسوا کن عذاب جس میں وہ مبتلا ہو جاتی ہے، یہ ہوتا ہے کہ مستبد اور سرکش قوتیں انہیں اپنا محکوم بنا لیتی ہیں۔

☆☆ قرآن کریم کی رُو سے وقت کی پابندی نہایت ضروری ہے خواہ وقت کسی مقصد کے لئے بھی کیوں نہ مقرر کیا جائے۔ جو قوم وقت کے معاملہ میں سہل انگار یا لاپرواہ ہوتی ہے، وہ کاروبارِ حیات میں ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لے گئے تثلیث کے فرزند، میراثِ خلیل

محشرستان فلسطین

﴿دوسری اور آخری قسط﴾

اعلان بالفور

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگارنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں، کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرق وسطی پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریک جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائز مین، صدر ذائنٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیاداں وائز مین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائز مین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلان بالفور ہے جو ۲/نومبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:-

> ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظر استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا۔ جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلان بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب غریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتام جنگ پر نوے فیصدی عرب تھے اور صرف دس فیصدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے۔ ایسی اقلیت کہ اسے ''غیر یہودی'' فرقہ' کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں اور مدبرین و سیاستدان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے۔ فلسطین کے اولین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے

آرہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فیصدی ہوسکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جاسکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جاسکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت

بہرکیف اعلان بالفور نے ''قومی وطن'' کا وعدہ کیا' نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ ''قومی وطن'' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی' لہذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین وقانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبط تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہوسکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء ورضامندی کے خلاف مسلط کئے جاسکتے ہیں؟

شاہ فیصل نے اعلان مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا:۔

> بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کرلیں...... لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہوگئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا اور یہ اعلان ساقط العمل' بیکار اور ناجائز ہو جائے گا اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جوابدہ نہیں رہوں گا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں۔ اعلان بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہوتو قابل عمل ورنہ بے کار' ناجائز' ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابند سلاسل کر دیا۔۔۔ لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلّف نہیں۔۔۔ لہذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساس مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔

برطانوی وعدے

یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران میں ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنی پہلے عربوں سے اور پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابل قبول وعمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کر سکتے تھے لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور عربوں سے کئے گئے' وعدوں کی ضد ہیں' غیر قانونی اور قابل استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک

دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشاء نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزور شمشیر مسلط کریں۔ اس سے فیصلہ انتداب بھی غلط ہو جاتا ہے اور فیصلہ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو، کہ وہی وجہ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیت اقوام متحدہ کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور بعض دیگر عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا۔ جمعیت اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدۂ امن کی خبر پا کر عربوں نے جولائی ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک موتمر طلب کی۔ اس موتمر کی قراردادوں میں ہے:-

ہم جنوبی شام میں جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولت مشترکہ (Jewish Common Wealth) قائم ہونی چاہئے۔ ہم یہودیوں کے داخلہ فلسطین کے ہی مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالک عربیہ میں عام جذبات نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، ان کی قربانیاں سب اکارت گئی تھیں۔ عربی حمیت، قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انہوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کرائے اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ --- غلامی! لعنت و ذلت!!

فیصل نے تنگ آ کر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شیطنت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا، اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ، کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابل ذکر ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدد صیہونیوں کی مذمت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر ہیں۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا ''غیر یہودی فرقوں'' کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداءً یہودیوں کے حامی تھے۔ اس کے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کر کے انہوں نے موتمر امن کو مشورہ دیا۔

''یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہئے اور فلسطین کو یہودی دولت مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہئے۔''

خلاف صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی کیونکہ ہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن ترک کر کر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکین وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی، اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائیٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہٹلر برسر اقتدار آیا۔ ہٹلر، پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہٰذا آئندہ تیاری سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی تحریکات کے ساتھ ساتھ خلاف صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔

چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فیصدی تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد پچپن ہزار سے پانچ لاکھ اناسی ہزار ہوگئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انہیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائیں گے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں اور بسا رہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیر اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہٰذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انہیں آبائی گھروں سے نکالا گیا ہے اس لئے انہیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد ''اینٹی سامی'' تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدردوں اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسا ہے اس سے ''سامی دشمنی'' کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی ''سامیوں'' (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انہوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ، برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے، جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں، انہیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

ہمدردان یہود نے یہودیوں کو ''سامی دشمنی'' کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقے میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی، اسے محبان اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی اسی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتداب فلسطین

انتداب فلسطین ''اے کلاس'' تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریز کی یہودی نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی ہے۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعراب فلسطین آزاد ہو سکیں گے؟ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے بانگ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے، معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی حقیقی وجوہات تھیں، اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن قائم کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابل عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے

تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی۔ فلسطین کی تقسیم! پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہو گی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکات مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ غیر ذی زرع صحرائی ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ۔۔۔ یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ سارے کا سارا قطعہ زمین بھی یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا جم غفیر یقیناً اس مختصر سے قطعہ ارض میں نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانہ سے عربوں کو کچلا نہیں جا رہا؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انہیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردی انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے بے کس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا؟ اس تاریخ میں فقید المثال قتل عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود اقوام متحدہ خاموش رہی، اور ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہودیوں کی نسبت زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

جہاد حریت

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیۃ اقوام کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی، سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انہیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی آغاز جنگ عالم گیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا۔ جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا۔ اس فریب میں کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انہیں مفت میں خرید دیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا۔ اور پرانا دوست، سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔ اس جہاد حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈ رائدن نے اپنی کتاب The Problem of Palestine میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہے:-

(انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انہیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی، سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے

اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سیچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے' ان کے لئے ناقابل برداشت جو برطانیہ' اس کے مدبرین اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کروں گی کہ آئرلینڈ کے زمانہ Black اور Tans کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی' یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں' ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بیکار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے چھٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جائے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ:

ایک صاحب نے' جن کا رنجدہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے' مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے ایک 'مجرم' کو دیکھا کہ وہ دوزانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار تعزیت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے یوں منتخب کیا ہو' قابل رحم نہیں' قابل عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سایہ میں ۱۹۳۸ء میں اس نے وڈ ہیڈ کمیشن (Wood Head Commision) بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی۔ بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے کہیں کہیں اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ خاموش اعتراف نمایاں ہے کہ تقسیم ناقابل عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی' عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوص نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے؟ انہوں نے پوری جرات سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروف گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ء کا مشہور قرطاس ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رو سے یہودیوں کی آمد پر سے مزید پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی اس شرط کے ساتھ کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آ سکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئیں گے۔ پانچ سال

کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی، عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید وفروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یعنی یہودیوں کی تعداد مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاس ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت وشوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا اور اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید وفروخت اور یہودیوں کے داخلہ سے متعلق ''پابندیوں'' پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاس ابیض کی رو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد ومتفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانان عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد، حزب عمال برسراقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر واقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسب منشاء کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا، تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار بتا رہے تھے۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالک عربیہ کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا، خبر مشہور ہوگئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پچھتر ہزار یہودی تو ''جائز'' طریقے سے آ گئے تھے، لیکن ان کی ناجائز آمد بھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے جنہیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ تھا۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول شخصے، اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار تھیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورت حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی امریکی کمیشن مرتب ہوا جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ بہر حال کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من وعن تسلیم

کر لیا کہ ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر کی تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی۔ بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوق شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر تولیت میں رکھ دینا چاہئے۔ زمینوں کی موجود پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبا دیا جائے۔

ایک دفعہ پھر "ثابت" کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین ناقابل عمل اور ناممکن ہے، معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

فلسطین اقوام متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ انتدابی عرصے میں برطانیہ کو جان اور مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔۔ انگریز اس زیاں سے تنگ آ گیا۔ کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ فلسطین اس کی کمر ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے ۲/اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش کر دیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطور بالا سے ظاہر ہو گا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوان نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ہر چند برطانیہ، امریکہ اور روس متحد تھے، لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہو سکے۔ امن ہوا تو جنگ کے یہ اتحادی دو فریقوں میں بٹ گئے۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا، اس سے وہ اپنی پہلی عظمت و استقامت بہت حد تک ضائع کر چکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم سے کم نقصان پہنچایا۔ امریکہ آئندہ جنگی ممکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس بھی اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصہ اس کا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی اہمیت ظاہر ہے۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرق وسطیٰ کا تیل ہے۔ تیل آئندہ جنگ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ممالک عربیہ کا تیل ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں۔ لیکن وہ تیل کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اس کی دلچسپی اسی ذہنیت کی آئینہ بردار ہے۔ ترکی اور ممالک عربیہ میں بھی اس کی 'دلچسپی' بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے، لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کا تیل مقابلتاً نو انکشاف۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہو گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں، اس لئے یہ نعمت عظمیٰ ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت پھر بڑھ جاتی ہے کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غماز ہیں۔

بہرکیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے

اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے' اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزاء عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کرلیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام' دو صفوں میں بٹ گئیں۔ ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نمبر (۱) ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے' دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان چودھری ظفر اللہ خان کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی نمبر ۲ نے اپنی مدلل و معقول رپورٹ[1] میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمعیۃ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو جمعیۃ اقوام کو یہ بھی حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دے' لیکن اگر اسے تسلیم بھی کرلیا جائے تو وہ مجلس عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کیے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا حق و اختیار نہیں تھا۔ چہ جائیکہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہئے۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کر لی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں' برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہوگا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ نہیں دے گا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵/مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتام انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا اور امن و امان کا تنہا محافظ ہوگا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵/مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا۔ گویا وہ فلسطین کے بعض حصوں پر قبضہ کرنے کے لئے یہودیوں کا راستہ بالکل ہموار کر دے گا۔

سب کمیٹی نے منشور اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضا مندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہئے تھا' نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔

یہودی تارکین وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے' اس لئے اس کے رقبہ' ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے۔

۱۔ جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم و ستم نہیں ہو رہا' اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲۔ جو باسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جاسکتے ان کو ارکان متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی' رقبہ' ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

[1] پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی نمبرا کے صدر نے سب کمیٹی نمبر ۲ کے صدر سر ظفر اللہ خان کے سامنے اعتراف کیا کہ آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر اللہ خان اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ صحت و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

۳۔ ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی اور مسئلہ زیر نظر کا صحیح حل تھیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوام متحدہ کے پیش نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی۔۔۔ لہٰذا حل ناممکن!

کمیٹی نمبر ا نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶/نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور مختصراً چودھری ظفر اللہ خان کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

۲۷/نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے جسے یوم تشکر (Thanks Giving) کہا جاتا ہے اس لئے ہر رکن حتیٰ کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔ اسی اعتبار سے جانبین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے میدان مار لیا ہے اور تقسیم دفن ہو گئی ہے۔ اس اثناء میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنی جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التواء کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ گذشتہ سال یوم تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا۔ لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہو گئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ تقسیم کے خلاف کئی مندوبین کی حکومتوں سے مصروف گفتگو ہوا اور انہیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دے دیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (Haiti) کے۔۔۔ نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے۔ لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آ گئی ہے۔

مسٹر روز ویلٹ نے کہ آنجہانی صدر روز ویلٹ کے پوتے ہیں۔ مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلے میں صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے۔

ارکان اقوام متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ٹیلی فونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں، تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولت عظمیٰ کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوام عالم کی قیادت کر دی ہے اور یہ ہے منظر

ادارہ اقوام متحدہ کا جو اس لئے معرض تشکیل میں آیا کہ کرۂ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے۔ اور اقدار انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن واماں کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاست دول عظمیٰ کا طغرائے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹/ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ میں ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرت رائے تو ہے، دو تہائی ووٹ نہیں بہرکیف یہودی ووٹوں کی خاطر تقسیم کا فیصلہ صادر کرا دیا گیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے، تقسیم کے مالہٗ وماعلیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ

اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین عرب، تین یہودی اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے تھے۔ ہر چند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابل عمل ہے۔

یہی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل ابیب (Tel Aviv) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف (Negev)۔ پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی (509780) عرب تھے اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (499020) یہودی۔ گویا یہودی حصہ میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجہ جواز یہ پیش کی گئی کہ یہودی بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھا لیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار (498000) یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار (435000) عرب رہ گئے۔۔۔ فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ ہے، جس میں سے تیرہ لاکھ عرب ہیں اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا۔۔۔ ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنا دینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی، کل آبادی کا ۳۳ فیصدی تھے۔ اس کے برعکس یہودی علاقہ میں عرب ۴۶ فیصدی تھے۔ گویا ۳۳ فیصدی کو ۶۷ فیصدی کی حکومت کے تحت اقلیت رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۶ فیصدی کو ۵۴ فیصدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزاء کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے گیلیلی میں چھیاسی ہزار عربوں کے مقابلہ میں اٹھائیس ہزار یہودی تھے۔ نجف کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنئے، صرف دو ہزار) یہودی تھے۔ وسطی علاقہ میں ساٹھ فیصدی یہودی اور ۴۰ فیصدی عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حالت اور نحیف ہو جاتی ہے۔۔۔ فلسطین کے ۱۴ یا ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقہ میں زمین کی نجی ملکیتوں میں عربوں کا ۶۰ فیصدی حصہ تھا اور یہودیوں کا ۴۰ فیصدی۔ اس کے باوجود تقسیم

روا رکھی گئی اور یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنہیں مزید ترقی دی جاسکتی تھی۔ لیکن عربوں کے حصہ میں پہاڑی علاقے آئے جو ناقابل ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کردی جائے۔

امریکہ کی مشکلات

تجویز تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تا کہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۱۶/فروری ۱۹۴۸ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا کہ صورت حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قوئ اندرون و بیرون فلسطین' جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزور شمشیر بدلنے پر کمر بستہ تھے اور یہودی بھی علیٰ ھذ القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے تھے۔ اختتام انتداب پر مکمل بدامنی پھیلنے کا خطرہ صاف نظر آرہا تھا۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرادے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جارہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدام جنگ سمجھیں گے اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے ۱۷/فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مارچ کے اوائل میں نیو یارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی مملکتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کردیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی ووٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کرسکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کردی۔ ۲۹/نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہوگئی تھی۔ چیکوسلواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشترا کی حکومت مسلط ہوگئی تھی۔ خرس روس کا سایہ فن لینڈ پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ پانچ مغربی قوئ۔۔۔ برطانیہ' فرانس' ہالینڈ' بلجیم' لکسمبرک کے مابین پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی ''مارشل امداد'' کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک حدتک جبری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اقوام متحدہ کے پاس منشور کی رو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی اور اگر قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آ پہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان گونا گوں مصائب میں مبتلا اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹/ مارچ کو اچانک یہ اعلان کردیا کہ وہ اب تقسیم کا موید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر

تولیت (Trustee-Ship) میں دے دیا جائے۔ نفاذ تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آرہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا، لیکن بالآخر اسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت نے نہ محض اس کے اپنے وقار کو صدمہ پہنچایا، بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوام متحدہ کی آزمائش تھا۔ لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتریں۔ اس جمعیۃ نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت ولعل، گومگو اور تذبذب میں ۱۵/مئی کی فیصلہ کن تاریخ آ پہنچی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آل اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے لعنت و ذلت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں چلی آرہی تھی، اپنی ساری شیطنت کاریوں کے ساتھ بیت المقدس کی گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کرنے لگی۔ یہودی، تابوت سکینت کے، طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے اور وہ انہیں بطور انعام خداوندی عطا ہوا تھا۔ تاکہ انہیں ''ظالمین'' کے بجائے ''صابرین'' اور ''مومنین'' بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آل اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی ''مصر'' میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ سود در سود اور چور بازاری کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی ''تابوت سکینت'' حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانون مشیت ایزدی کے تحت ملتا ہے لیکن جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵/مئی کے بعد فلسطین میں ''اسرائیلی حکومت'' کا اعلان کر دیا۔ اس کا مرکز تل ابیب ہے۔ اس حکومت کی حیثیت کیا تھی اور اس کی سرحدیں کونسی؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا تھا۔ صدر ٹرومین گذشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا، لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا تھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا کہ وہ نمائندہ تھا، گذشتہ سولہ سال سے برسر اقتدار چلی آرہی تھی۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ٹرومین ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار تھا جو اسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہوتی۔ یہودی اہم مہرہ تھے۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کر دیا۔ ادھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ شکاگو ٹریبون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸/مئی کی اشاعت میں لکھا۔

ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کون سی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

شرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ

سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو بلاوجہ فوراً تسلیم کر لیا ہے۔

امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا۔ روس پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

جن حالات میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ یہ نتیجہ ہے منظم بین الاقوامی سازش کا' یہ دراصل میوۂ تلخ ہے اس تخم خبیث کا جسے عیسائیت اپنی روح کی گہرائیوں میں بوتی چلی آئی۔ صلیبی جنگوں میں اسی کی فصل پک کر تیار ہوئی تھی اور ہلال اسلام کی درانتی سے خوب خوب کٹی تھی۔ یورپ کی تہذیب جدید نے اس فصل کی از سرنو آبیاری کی۔ انگریز اس ذہنیت کا زندہ مجسمہ تھا۔ چنانچہ اس کی پوری استعماری تاریخ اس نکتہ کی تفسیر ہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کو اس نے حرف غلط کی طرح مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ سلب ونہب سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس نے برہمن سے ملی بھگت کی اور اس مہرے سے انہیں شہ مات دینے میں مصروف ومنہمک رہا۔ جب اسے آخر کار برصغیر کو یوں آزاد کرنا پڑا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا' تو اس نے افراتفری مچا دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان پہلے دن سے ہی یوں ہندو کے رحم و کرم پر ہو جائے' کہ اس کا ہونا' نہ ہونا برابر ہو۔ اس پر بھی وہ اقوام عالم کی صف میں بیٹھ کر پوری ڈھٹائی سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ اس نے خوش دلی سے برصغیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

اس ''خوش دلی'' کا مظاہرہ فلسطین میں بھی ہوا۔ یہودی ترک وطن کے برساتی نالوں کا رخ موڑ موڑ کر اس نے یہودی آبادی کو عربوں کے برابر کر دیا اور اسے ایک حکومت کی طرح مسلح ہونے کے مواقع مہیا کئے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہودی قزاق ہر طرح تیار ہیں تو از خود اپنے انخلاء کی ایک تاریخ مقرر کر کے فلسطین چھوڑ کے چلا گیا۔ اس نے اختیارات منتقل کرنے کی معروف صورت اختیار نہیں کی۔ اسے چاہئے تو یہ تھا کہ حکومت مقامی نمائندوں کو سونپ دیتا اور اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اقوام متحدہ سے درخواست کرتا کہ وہ کوئی مناسب متبادل انتظام کر دے' یعنی خود اس انتظام کو سنبھال لے۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور عربوں اور یہودیوں کی جنگ کے باوجود فلسطین کو چھوڑ دیا۔ اسرائیل کو معرض وجود میں لانے کی یہی واحد اور یقینی صورت تھی۔ یہودیوں اور عربوں کو لڑتا چھوڑ کر آ جانے کے بعد اس نے اقوام متحدہ سے درخواست کی کہ وہ معاملہ کو ہاتھ میں لے۔ اقوام متحدہ میں سازش کا رشتہ امریکہ نے سنبھال لیا اور اس نے اسرائیل کی غاصب حکومت پر عالمی مہر تصدیق ثبت کرا دی اور اس کا راستہ بھی ہموار کر دیا کہ اقوام متحدہ نے اپنی تجویز تقسیم میں جتنے علاقے یہودیوں کے لئے تجویز کئے تھے۔ وہ ان سے کہیں زیادہ ہتھیا کر بیٹھ جائیں۔ فلسطین کا مسئلہ انیس سال سے اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہے لیکن وہ اس رکن ملک کو اس حد تک مجبور کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ انہیں علاقوں پر قناعت کرنے پر راضی ہو جائے جو اقوام متحدہ نے اپنے طور پر انہیں دینا چاہے تھے۔ اس کی وجہ سے گو عربوں کا موقف اقوام متحدہ کے باہر یہی ہے کہ غاصب حکومت اسرائیل کو ختم ہونا چاہئے' لیکن اقوام متحدہ کے اندر وہ یہی مطالبہ کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کرنے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لئے اقوام متحدہ نے متعین کی تھیں۔

انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فلسطین چھوڑ دیا تو فلسطین میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بھی تھی اور عربوں اور عربوں کے درمیان بھی۔ عربوں کے باہمی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑتے لڑتے بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ آئے اور لڑے بھی وہ فلسطین ہی کے محاذ پر۔ بلکہ ان کی نگاہ یہودی دشمن پر کم اور عرب ہمسائے پر زیادہ تھی۔ یعنی ان کی کوشش زیادہ تر یہ نہیں تھی کہ یہودیوں کا راستہ روکا جائے۔

بلکہ یہ کہ ان کا دوسرا عرب بھائی فلسطین کا کوئی حصہ یہودیوں سے چھین کر اپنے تصرف میں نہ لے لے۔ انہیں ڈر یہ تھا کہ جس کسی نے بھی فلسطین کا کچھ حصہ آزاد کرالیا وہ اسی کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اور پھر اس کی سلطنت کی حدود اسی تناسب سے وسیع ہو جائیں گی۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے' کہ کوئی عرب ملک ان کے مقابلے میں اس طرح پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو جائے۔ اس قسم کا تصادم اغراض مصر اور اردن (جو ان دنوں شرق اردن کہلاتا تھا) کے درمیان خصوصیت سے زیادہ تھا۔ اتفاق سے عربوں میں (شرق) اردن ہی ایک ایسا ملک تھا جس کے پاس منظم اور جنگجو فوج تھی۔ چنانچہ گو مصر نے فلسطین کے جنوبی صحرا کے کچھ حصوں پر قبضہ کرلیا' اردن نے دریائے اردن کے مغرب کا اچھا خاصا علاقہ آزاد کرالیا اور مسلمانوں کے متعدد مقامات مقدسہ' حتیٰ کہ یروشلم کے پرانے حصے کو بھی یہودیوں کی دستبرد سے بچالیا' اس بنا پر وہ شرق اردن سے اردن بن گیا۔ لیکن اس طرح ایک ایسی استخوان نزاع پیدا ہوگئی کہ عرب آج تک فلسطین کے بارے میں کوئی مشترک لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ ابھی حال ہی میں ہوا تھا' کہ اردن کی حکومت کو دست بردار ہو جانا چاہئے۔ گویا فوری مسئلہ اسرائیل کی جارحیت نہیں تھا' شاہ حسین کی معزولی تھا۔

اردن کا ردعمل اسرائیل کے خلاف بالعموم قابل تعریف رہا۔ شاہ حسین اس ناخواندہ اور غاصب مملکت کے اس حد تک خلاف ہیں کہ انہوں نے ایک شاہی مجلس اس مقصد کے لئے قائم کر رکھی ہے کہ اردن پر جارحانہ حملہ ہوا تو وہ خود لڑنے کے لئے محاذ پر پہنچیں گے اور اگر وہ کام آگئے تو یہ مجلس کاروبار حکومت سنبھال لے گی انہوں نے ان فلسطینیوں کو بھی حقوق شہریت دے دیئے جو ان کے ملک میں آگئے ہیں۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور الجھا ہے۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ الجھا دیا گیا ہے۔ یہودیوں نے جن علاقوں پر تسلط جما لیا ہے' ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ان مظلومین کو عربوں نے اپنے ہاں ابھی تک آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آباد ہو کر عرب ممالک میں جذب ہو گئے تو فلسطین کو بھول جائیں گے اور اس طرح تحریک استخلاص فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ اس موقف کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اگر فلسطینیوں کو متعلقہ ممالک میں آباد ہونے دیا گیا تو دریائے اردن کے مغرب میں جو فلسطینی اردن کے حصے میں آئے ہیں' انہیں اور ان کے علاقے کو اردن کا حصہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لئے فلسطینی مظلومین کو اپنا ٹھہری تسلیم نہیں کیا گیا۔ چنانچہ صورت یہ ہے کہ اس وقت کم و بیش تیرہ لاکھ مہاجرین کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں جو قائم تو مختلف عرب ممالک میں ہیں لیکن ان کا انتظام اقوام متحدہ کے ایک ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ادارہ بامر مجبور یہ انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور مہاجرین بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہیں۔ زندگی کی آسائشوں سے وہ بالعموم محروم ہیں اور نہ گھر کے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔ عرب ممالک بہرحال اقوام متحدہ پر کڑی نکتہ چینی تو کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان بے گھر فلسطینیوں کے لئے مناسب انتظام نہیں کرتی لیکن وہ خود انہیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے' نہ ان کے مصائب کے ازالے کے لئے کوئی اقدامات ہی کرتے ہیں۔ اہل فلسطین ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اب تک (یعنی ۱۹۶۷ء تک) ایک نئی نسل کیمپوں میں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے۔ اس پوری نسل کا کیا ہوگا؟ اور بات ایک نسل کی نہیں' دوسری نسل ان کے پہلو بہ پہلو تیار ہو رہی ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟ کون ذمہ دار ہے اس کا؟ یہ نسلیں کس گناہ کی پاداش میں ''قتل'' ہو رہی ہیں؟ ہر گزرنے والا سال عربوں سے یہ سوال پوچھتا ہے۔۔۔ اور ان کا دامن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عرب ایک دوسرے کا دامن کھینچ کھینچ کر انہیں تار تار کرنے سے ہنوز فارغ نہیں ہو سکے اور نہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں تشتت وافتراق کو روک سکیں گے۔

فلسطین کے مسئلہ پر عرب سربراہ بھی کئی بار مل بیٹھے ہیں اور عرب لیگ کے نمائندوں نے بھی بارہا سر جوڑے ہیں۔ انہوں نے مشترکہ دفاع تک کا منصوبہ تیار کیا ہے لیکن کوئی عملی

کام نہیں ہو سکا کیونکہ یہی طے نہیں ہو پاتا کہ فلسطین کو آزاد کیسے کرایا جائے۔ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا کہ عرب ممالک مشترکہ جدوجہد کریں۔ حالانکہ مل جل کر ہی یہودیوں کے خلاف مؤثر محاذ قائم کیا جاسکتا ہے۔ یہ تجویز بار بار پیش کی جاتی ہے کہ فلسطینیوں کو منظم کر کے انہیں یہودیوں کے خلاف لڑنے دیا جائے اور پھر ان کی امداد کی جائے۔ گویا جس طرح الجزائری مجاہد فرانس کے خلاف لڑے' اسی طرح فلسطینی یہودیوں کے خلاف لڑیں' یہ درست' لیکن اس تجویز کا محرک جذبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطین کا جو حصہ اردن کے پاس ہے وہ اردن سے ''آزاد'' ہو جائے گا اور اردن' شرق اردن بن کے رہ جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت حال ہی میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مصر کی فوجیں بھی اردن میں متعین کی جائیں تا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑسکیں۔ اس کا جواب بجا طور پر' اردن نے یہ دیا کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اول تو ہر ملک کی فوجیں ان سرحدوں پر موجود ہونی چاہئیں جو اسرائیل سے ملتی ہیں' دوسرے مصر کو اسرائیل ہی کے مقابلے کا خیال ہے تو وہ اپنی فوجیں یمن سے کیوں واپس بلا نہیں لیتا۔ واضح رہے کہ مصر کی چالیس ہزار سے زائد فوج کئی سالوں سے یمن میں مقیم ہے اور معزول امام یمن اور شاہ سعود کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ فوج اسرائیل کے خلاف کام میں لائی جاسکتی ہے اور لائی جانی چاہئے۔ لیکن عربوں کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی قوت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہی ضائع ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی زبانی مخالفت اور باہمی خانہ جنگی کا سنگین نتیجہ ۱۹۵۶ء میں نکلا جب اسرائیل' فرانس اور برطانیہ نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان میں سے کسی ایک طاقت کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن روس کی مداخلت اور روس اور امریکہ کی مسابقت کے طفیل اس کھلی جارحیت کو روک دیا گیا اور اقوام متحدہ نے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر بین الاقوامی فوج متعین کر دی۔ اس جارحیت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ مصر نے نہر سویز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس آبی شاہراہ پر بین الاقوامی تسلط ختم ہو گیا۔ اس طرح ان سازشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا' جو اس تسلط کے طفیل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں ہے۔ نہر سویز پر قبضہ کر لینے سے اسرائیل کی ناکہ بندی نسبتاً اور مضبوط ہو گئی لیکن محض اس طرح کی ناکہ بندی فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ عملی سبق بالکل نہیں بھولنا چاہئے کہ کسی ملک کی ناکہ بندی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ تو اس وقت اقوام عالم نے اس کی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ناکہ بندی کب سے ہو رہی ہے۔ رہوڈیشیا کی ناکہ بندی کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ناکہ بندی کے یہ فیصلے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھے کیونکہ بہت سی قومیں ان کی مؤید تھیں۔ اگر وہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکے تو عربوں کی طرف سے اسرائیل کی محدود ناکہ بندی نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناکہ بندی نہ کی جائے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تنہا ناکہ بندی کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ امریکہ اس ناکہ بندی میں نہ محض شریک نہیں' وہ اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ عرب ایک راستہ بند کرتے ہیں تو امریکہ کے ہاتھوں کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ در مسلسل کھل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ عرب بھی جانتے ہیں اور دنیا ساری بھی جانتی ہے۔

اسرائیل بہت بڑا خطرہ ہے۔ مزید خطرہ یہ ہے کہ اس کی سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔۔۔ کبھی سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اب صرف مقبوضہ فلسطین میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہودی مسلسل اسرائیل میں درآمد کئے جا رہے ہیں۔ اسرائیل کے جارحانہ عزائم اپنی جگہ' محض بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر ایک نہ ایک دن اسرائیل کو مزید علاقے کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے توسیع ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ گویا یہودی ''مجبور'' ہوتے جا رہے ہیں کہ وہ مزید عربی علاقے ہتھیائیں۔ یہ علاقے انہیں عربوں سے فتح کرنے ہوں گے۔

وہ اس کے لئے شبانہ روز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خطرناک جنگی تیاریاں بھی کر رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے صحراؤں کو آبادکاری کے قابل بھی بنا رہے ہیں۔ جہاں تک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے' اسرائیل امریکہ کی شہ پر اور مدد سے' ایٹمی طاقت بننے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس چور دروازے سے بھارت کو بھی مدد دی جا رہی ہے۔ عرب اسے جانتے ہوئے بھی بھارت کو دوست سمجھے جا رہے ہیں۔ جہاں تک یہودی آبادکاری کا تعلق ہے' اس سے عربوں کے لئے بالعموم اور اردن کے لئے بالخصوص ایک نیا فتنہ پیدا ہو گیا ہے۔ اسرائیل یہ منصوبہ روبہ عمل لا رہا ہے کہ جھیل گلیلی کا پانی نکال کر اپنے صحراؤں کو مزید یہودیوں کے لئے قابل رہائش بنائے۔ اس منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے اردن' جس پر اردن کی معیشت کا دارومدار ہے' خشک ہو جائے اور یہ ملک صحرا بن جائے۔ اردن کے کہنے پر عربوں نے اس کا جواب یہ سوچا ہے کہ جو دریا جھیل گلیلی میں آ کر گرتے ہیں' ان کا رخ اوپر سے ہی موڑ دیا جائے۔ اسرائیلی منصوبے کا یہ ایک حد تک جواب تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عرب ایسا کر گزریں گے؟ اسرائیل نے فیصلہ ہی نہیں کیا' وہ تو عمل بھی کر رہا ہے۔ عرب باتیں ہی کئے جا رہے ہیں۔ وہ اگر باتیں ہی کرتے تو توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر عمل کا مرحلہ بھی آ جائے گا۔ لیکن وہ باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھ جاتے ہیں اور اسرائیل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ اس مسلسل جارحیت کا جواب نہیں جو برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے اسرائیل کی شکل میں عربوں کے خلاف روا رکھی گئی۔ اور جو کسی وقت بھی عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن عرب شاید یہ تو سمجھ گئے ہیں کہ ع

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

لیکن یہ راز جانے وہ کب پائیں ع

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی تربیت و لذت نمود میں ہے!

فلسطین کے مرض کہن کا چارہ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

(نوشتہ ۱۹۶۷ء)

۲۵ سالہ تجربہ کار
پیپلز کلیرنگ ایجنسی
کسٹم ھاؤس سے منظور شدہ
کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹ
کلیرنگ اور فارورڈنگ کے معاملات میں ایک قدم آگے
ہمارے ۲۵ سالہ تجربہ سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ۔
ہم آپکی خدمت کیلئے ہمہ وقت تیار ھیں۔
۵۔ وقار سینٹر، فرسٹ فلور، رام بھارتی اسٹریٹ، جوڑیا بازار۔ کراچی
فون: ۲۴۲۶۱۲۸
۲۴۳۱۰۴۵-۲۴۳۷۵۳۷
فیکس نمبر :-
ٹیلیکس: ۲۱۰۴۳ BTC PK

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(لغات القرآن)

ارض

اَرْضٌ۔ زمین۔ ہر وہ چیز جو نیچے ہو' اَرْضٌ کہلاتی ہے۔ (برعکس سَمَاءٌ کے) چنانچہ اَرْضُ النَّعْلِ۔ جوتے کے تلے کو کہتے ہیں۔ نیز ٹانگوں کا وہ حصہ جو گھٹنے سے نیچے ہو اَرْضٌ کہلاتا ہے۔ زمین کو بھی اَرْضٌ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پاؤں کے نیچے رہتی ہے (تاج)۔

چونکہ انسانی معاش کا بنیادی ذریعہ اَرْضٌ (زمین) ہے اس لئے اَلْاَرَاضَۃُ خوش حالی اور شادابی کو کہتے ہیں (تاج)۔ اَرُضَتِ الْاَرْضُ کے معنے ہیں زمین عمدہ ہو گئی۔ اس میں بہت پیداوار ہونے لگی اور اس لئے آنکھوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (تاج)۔ جَدْیٌ اَرِیْضٌ کے معنی ہیں بکری کا موٹا اور فربہ بچہ (تاج)۔ اَلْاَرَضُ دیمک کو کہتے ہیں (تاج)۔

چونکہ اَرْضٌ نچلی چیز کو کہتے ہیں اس لئے اَرَاضَۃٌ کے معنی ہیں کسی کا منکسر المزاج یا مطیع و فرمانبردار ہو جانا (لین)۔ اَرِیْضٌ کے معنی ہیں خلیق آدمی۔ یا نرم اور عمدہ زمین۔ اس میں خیر کا پہلو غالب ہوتا ہے (ابن فارس)۔ قرآن میں جِبَالٌ کے ساتھ اَرْضٌ کا لفظ آیا ہے۔ (مثلاً یَوْمَ نُسَیِّرُ الْجِبَالَ وَ تَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً (18:47)۔ "جس دور میں ہم جبل کو (اپنے غلبہ اور قوت سے) ان کی جگہ سے ہلا کر الگ کر دیں گے اور ارض ابھر کر سامنے آجائے گی"۔ ان مقامات میں جبال کے مجازی معنی ہونگے بڑے بڑے لوگ (قوم کے اکابر) اور ارض کے مجازی معنی چھوٹے طبقے کے لوگ۔

اَرْضٌ وَ سَمٰوٰتٌ کے معنی کائنات کی پستیاں اور بلندیاں ہونگے۔ اور جہاں ان الفاظ کا تعلق زندگی کے کسی پہلو سے ہو گا تو سَمَاءٌ کے معنی خدا کا کائناتی قانون اور اَرْضٌ کے معنی انسان کی معاشی زندگی ہونگے۔ قرآن نے اَرْضٌ کے متعلق کہا ہے کہ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (7:10)۔ "ہم نے تمہارے لئے زمین میں سامان معیشت رکھے ہیں"۔ اگر آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سامان زیست کا اصلی سرچشمہ ارض ہی ہے۔ اس لئے یہ لفظ وسائل و ذرائع رزق کے لئے استعمال ہوا ہے (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان س۔ م۔ و)۔ اگر معاشی زندگی کو خدا کے کائناتی قانون (یا قرآن کے ضابطہ حیات) سے الگ کر لیا جائے تو وہ نہایت پست سطح کی (حیوانی) زندگی ہو جاتی ہے جس میں طبعی زندگی سے متعلق مفاد عاجلہ تو حاصل ہو جاتے ہیں لیکن انسانی زندگی کا بلند نصب العین حاصل نہیں ہوتا۔ اس قسم کی معاش کو قرآن نے عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی (7:169)۔ "اس قریبی زندگی کی متاع" کہہ کر پکارا ہے۔ اور اسے رفعت (بلندی) کے مقابلہ میں پستی قرار دیا ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (7:176)۔ "ہم چاہتے تھے کہ اپنے قانون مشیت کے مطابق اسے (انسان کو) بلندی عطا کر دیں لیکن وہ پستی کے ساتھ چمٹ گیا"۔ اسی کو جذبات پرستی۔ خود غرضی یا نفسانیت اور مفاد پرستی کہا گیا ہے۔ یعنی صرف طبعی زندگی کے مفاد کو

مقصد حیات قرار دے لینا۔ قرآن کے الفاظ میں وَاتَّبَعَ هَوٰهُ (7:176)۔ "اس نے اپنی خواہشات کا اتباع کر لیا"۔ توحید یہ ہے کہ خدا کا جو قانون خارجی کائناتی زندگی میں کارفرما ہے اسی قانون کو انسان کی معاشی زندگی کا مدار بنایا جائے۔ (یہ قانون وحی کے ذریعے ملتا ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے)۔ اس توحید کے معنی یہ ہیں کہ ارض اور سماء میں ایک ہی قانون کو تسلیم کیا جائے۔ هُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِی الْاَرْضِ اِلٰهٌ (43:84)۔ "ارض و سماء میں وہی صاحب اقتدار ہے"۔ اگر انسان اپنی معاشی زندگی کو (قانون خداوندی کے بجائے) اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع رکھے تو معاشرہ میں ناہمواریوں کا جنم پیدا ہو جاتا ہے۔ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ یُنْشِرُوْنَ۔ لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (21:21-22)۔ "کیا انہوں نے اپنی معاشی زندگی کے لئے اور قوتوں کو صاحب اقتدار تسلیم کر رکھا ہے جن کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ وہ ان کی معاشی زندگی کو حیات نو عطا کر دیں گے۔ اگر ارض و سماء میں اللہ کے سوا اور صاحب اقتدار ہستیاں ہوں تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ارض (زمین) نوع انسانی کے لئے رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کسی فرد کی ملکیت میں نہیں جا سکتی۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (55:10)۔ کے یہی معنی ہیں (یعنی ارض کو مخلوق کے فائدے کے لئے بنایا ہے)۔ دوسری جگہ ہے مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (80:22)۔ "تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لئے سامان زیست۔ متاع حیات"۔ نہ صرف زمین بلکہ دیگر عناصر طبعی جن کے امتزاج و تعاون سے زمین سے رزق پیدا ہوتا ہے، ان سب کے متعلق فرمایا کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (56:74)۔ ہیں۔ یعنی بھوکوں کے لئے سامان زیست۔ لہٰذا کوئی نظام جس میں ارض تمام نوع انسانی کے مشترکہ فائدہ کی بجائے کسی خاص گروہ یا افراد کے فائدے کی موجب بن کر رہ جائے، قرآنی تعلیم (یعنی منشائے خداوندی) کے خلاف ہے۔ اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ اس رزق کے سرچشمے (یعنی زمین کی پیداوار) کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (41:10)۔ وسائل پیداوار اور سامان زیست (مثلاً روشنی، ہوا، پانی، زمین، قرآنی معاشرہ کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افراد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ یہ وہ انقلاب ہے جسے قرآن چھٹی صدی عیسوی میں اس وقت لایا جب دنیا جاگیرداری اور زمینداری کو عین "مطابق فطرت" سمجھے ہوئے تھی۔ دنیا نے اس وقت اس انقلاب کی اہمیت کو نہ سمجھا (اور بعد میں خود مسلمانوں نے بھی اسے پس پشت ڈال دیا) لیکن اب وہی دنیا، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس کی طرف کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ...... (13:41)۔ "کیا یہ اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھ سے چھین کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں"۔ اس طرح بتدریج وہ وقت آ جائے گا جب زمین کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں رہے گی بلکہ تمام افراد انسانیہ کی پرورش کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ وہ دور ہو گا جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69)۔ "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد علی فارق

پاکستان میں ملکیت اراضی کا مسئلہ اور

جماعت اسلامی کے بدلتے نظریات

قرآن حکیم نے ایک اصول بیان کیا ہے کہ ''لیس للانسان الا ماسعی (۵۳/۲۹)'' انسان صرف اپنی محنت (کے ماحصل) کا مالک ہے۔ زمین و آسمان اور ان میں پوشیدہ بے شمار خزانے جن پر انسان کی محنت صرف نہیں ہوئی اس کا یہ مالک نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام چیزیں خدا کی ملکیت ہیں اور انسانیت کے فائدے کے لیے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے کہا ہے کہ ''ھو الذی خلق لکم فی الارض جمیعاً (۲/۲۹)'' خدا وہ ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے (فائدہ اٹھانے) کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ سب کچھ ''متاعاً لکم'' (۷۹/۳۰،۳۲) تمہارے فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ اس کی عملی صورت یہی ہوتی ہے کہ زمین کو اماناً اسلامی حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ اس امانت کو افراد معاشرہ کی پرورش اور مفاد عامہ کے لیے وقف رکھے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ کوئی بھی ریاست اور مرکزی نظام تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک اس کے پاس وہ ذرائع نہ ہوں جن کے ذریعہ یہ فریضہ سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے خدا نے زمین کو تمام انسانوں کے لئے متاع کہا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ''الارض للہ'' زمین خدا کی ہے'، یہ حقیقت اس قدر ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو یہ ظاہر چیز نظر نہیں آتی وہ کافر ہیں۔

پاکستان کا قیام اسی نظام کو قائم کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اراضی ہند کے متعلق ممتاز علمائے کرام کی بھی یہی تحقیق تھی کہ تمام اراضی مملکت کی ملکیت ہیں نہ کہ کسی فرد اور شخص کی چنانچہ اس سلسلہ میں شیخ جلال تھانیسری اور حضرت علامی محمد اعلیٰ تھانوی جیسے جلیل القدر تبحر علماء کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان کی ان تمام زمینوں کا انگریزی راج کے بعد بھی وہ حکم ہے جو عہد مغلیہ میں تھا (عہد مغلیہ میں تمام زمینیں حکومت کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں) اور یہ خرید و فروخت کے باوجود زمینداروں اور تعلقہ داروں کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز نے اپنے فتاویٰ کی ہر دو جلد میں مختلف جگہ اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

(ترجمہ) حضرت شیخ جلال الدین تھانیسری قدس اللہ سرہ العزیز نے ایک رسالہ اراضی ہند کے احکام کے بارہ میں لکھا ہے اور اس رسالہ میں انہوں نے اس مذہب کو (کہ ہندوستان کی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے) بہت سے دلائل و شواہد سے باطل قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی اراضی آج بھی بدستور سابق عراق کی اراضی کی طرح عامہ مسلمین کے لیے وقف ہیں یعنی بیت المال کی ملکیت ہیں کسی شخص یا فرد کی ملکیت نہیں اور نہ زمینداروں کی ملکیت اور زمینداروں کو نگران ہونے سے زیادہ کوئی دخل نہیں ہے اور قاضی محمد اعلیٰ تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس بارہ میں ایک

رسالہ تصنیف کیا ہے اور انہوں نے اس میں شیخ جلال ہی کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

شاید اس مسلک کی بنیاد پر جو کہ حضرت شیخ جلال تھانیسری قدس اللہ سرہ نے اپنے رسالہ میں اختیار فرمایا ہے کہ ہندوستان کی زمین ابتدائے فتح میں عراق کی طرح (جو حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتح ہوا تھا) بیت المال ہی کی ملک پر قائم ہے اور زمینداروں کو اس کے سوا کہ وہ اس کے متولی و داروغہ ہیں اور کاشتکاروں کو تلاش کر کے زمین دینے اور زراعت میں اعانت بہم پہنچانے اور اسی ذمہ داری کے غور وفکر میں رہنے کے اور کوئی حق حاصل نہیں ہے اور نہ ان کی ملکیت کو کوئی دخل ہے۔ چنانچہ لفظ زمیندار بھی اسی کی خبر دیتا ہے اور زمینداری میں تغیر وتبدل اور عزل ونصب اور بعض کا اخراج اور بعض کے لیے اثبات اور بعض کو داد و دہش' مثلاً افغان' بلوچ' سادات اور مشائخ وغیرہ کو زمینداری کے اصول پر زمینیں دینا اس دعویٰ کی صریح تائید کرتے ہیں''۔ (بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام۔ از حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سوہاروی ۵۸۔ ۲۵۷) ''اور مولانا محمد اعلیٰ تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ ہیں یعنی بیت المال اور حکومت کی ملکیت ہیں''۔ (ایضاً ۳۵۹ بحوالہ العرف الشذی ۲۸۶ تقریر درس حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری)

پاکستان بن جانے کے بعد جب اس ملک میں نظام حکومت کی تفصیلات طے کرنے کا مرحلہ آیا تو ملکیت اراضی کے مسئلہ کے متعلق بھی مختلف قسم کے نظریات سامنے آئے۔ اس سلسلہ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم فرماتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ بعض جگہ بہت بڑے بڑے رقبے جو ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ایکڑ تک بھی وسیع ہیں کچھ خاندانوں کے پاس جاگیر یا زمینداری کے طور پر مدتوں سے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو انگریزی حکومت نے ملک پر قابض ہونے کے بعد غداریوں کے صلے میں اصل حقداروں سے چھین کر دیئے تھے۔ بعض انگریزی دور سے پہلے مختلف زمانوں میں جا و بے جا طریقوں سے موجودہ مالکوں کے اسلاف کو عطا کئے گئے تھے۔ بعض جزوی یا کلی طور پر خریدے بھی گئے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ سرداران قبائل نے گزشتہ صدیوں میں کسی وقت ان پر قبضہ کر لیا تھا ان سب کے متعلق آج یہ تحقیق کرنا سخت مشکل ہے کہ کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی اور آیا وہ شرعاً جائز نوعیت کی تھی یا ناجائز نوعیت کی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے رقبوں کی ملکیت سے جن کا جائز ہونا بھی متحقق نہیں ہے ہمارے نظام معیشت میں سخت ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ اس حالت میں شرعاً یہ درست ہوگا کہ ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی ایک حد مقرر کر دی جائے اور اس حد سے زائد جو رقبے لوگوں کے پاس ہوں ان کو ایک منصفانہ شرح سے خرید کر آگے غیر مالک کاشتکاروں کے ہاتھ منصفانہ شرح پر فروخت کر دیا جائے۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص ۱۱۱۔ ۱۱۰) مرحوم نے عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی حد بندی کرنے کی بات اس لئے کی تھی کہ ان کے نزدیک جائز ملکیت میں کسی نوع کی حد بندی نہیں لگائی جا سکتی۔ وہ اپنی اس کتاب میں فرماتے ہیں۔ ''اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر اصولاً نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں۔ جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں'' (ص ۱۰۹)۔ مرحوم اس سلسلہ میں اپنی ایک اور کتاب میں فرماتے ہیں۔ ''اسلام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے' جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لیے مقرر ہیں' ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز' اس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزار ہا ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو' اگر کسی قانونی صورت میں آدمی کی ملک میں آئی ہے تو بہر حال وہ اس کی جائز ملک ہے۔ اس کے لیے خود

کاشت کرنے کی بھی قید نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جا سکتا ہے اور تجارت میں شرکت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح زمین بھی کرائے پر بھی دی جا سکتی ہے اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہو سکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے یا بٹائی لیے بغیر کسی کو اپنی زمین کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے، مگر کرایہ ولگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ویسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا۔ رہیں ''نظام جاگیرداری'' کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے یا اس پر مصنوعی حد بندیاں عائد کی جائیں۔ جو ''زرعی اصلاحات'' کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں''۔ (اسلام اور جدید معاشی نظریات ص ۱۲۸۔۱۲۷) زمین کی شخصی ملکیت ختم کرنے یا اس پر مصنوعی حد بندیاں عائد کرنے کا نام ''زرعی اصلاحات'' رکھنے سے انہیں اس لئے اتفاق نہ تھا کہ ان کے نزدیک ایسی حد بندیوں کے لیے فی الحقیقت کتاب وسنت میں کوئی اصل موجود نہیں۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص ۹۱۔۹۰)

مودودی مرحوم کا پاکستان کے زرعی مسئلہ کے متعلق موقف یہی تھا۔ تاہم ۱۹۶۹ء کو جماعت اسلامی نے جو منشور پیش کیا تھا اور جسے ۲۰ دسمبر ۱۹۶۹ء کو جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے منظور کیا تھا اس کے صفحہ ۴۳ پر زراعت کے عنوان کے تحت کہا گیا تھا کہ ''ایک طویل مدت تک زرعی املاک کے معاملہ میں نہایت غلط نظام رائج رہنے کی وجہ سے جو ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں ان کو ختم کرنے کے لئے شریعت کے اس قاعدے پر عمل کیا جائے گا کہ ''غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں''۔ اس قاعدے کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔

(الف) ان تمام نئی اور پرانی جاگیرداریوں کو قطعی ختم کر دیا جائے گا جو کسی دور حکومت میں اختیارات کے ناجائز استعمال سے پیدا ہوئی ہوں کیونکہ ان کی ملکیت ہی شرعی طور پر صحیح نہیں ہے۔

(ب) قدیم املاک کے معاملے میں زمین کی ملکیت کو ایک خاص حد تک محدود کر دیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کے زرخیز علاقوں میں یہ حد زمین کی پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے (۱۰۰) اور دو سو (۲۰۰) ایکڑ کے درمیان ہو گی اور جن علاقوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت بہت کم ہے وہاں اس معیار کے لحاظ سے حد مقرر کی جائے گی۔ مشرقی پاکستان میں ۱۰۰ ایکھا کی حد رکھی جائے گی۔ اس سے زائد ملکیتوں کو منصفانہ شرح پر خرید لیا جائے گا۔ یہ تحدید صرف عارضی اور پچھلی ناہمواریاں دور کرنے کے لیے کی جائے گی۔ اسے مستقل حیثیت نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ مستقل تحدید صرف اسلامی قانون وراثت ہی سے نہیں بلکہ متعدد دوسرے شرعی قوانین سے بھی متصادم ہوتی ہے''۔

یہ موقف انہوں نے غیر معمولی حالات کے پیش نظر اختیار کیا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے قبل کہہ چکے تھے کہ نظام جاگیرداری کی خرابیوں کا علاج یہ نہیں ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے یا اس پر مصنوعی حد بندیاں عائد کی جائیں جو ''زرعی اصلاحات'' کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں۔ پاکستان میں دو مرتبہ زرعی اصلاحات کی گئیں۔ لیکن جاگیرداروں نے کس کس طرح اپنی زمینوں کو محدود ہونے سے بچائے رکھا اس کے لیے متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اس موقع پر صرف ایک دلچسپ مثال پیش کی جاتی ہے جو روزنامہ نوائے وقت لاہور کے شمارہ پندرہ ستمبر ۱۹۸۵ء میں مشہور کالم نویس جناب ظفر اقبال صاحب نے درج کی تھی وہ لکھتے ہیں:

''کئی سال پہلے ملتان کے ایک سابق کمشنر نے تقریباً چھ کروڑ روپے کی مالیت کا ایک زرعی فارم

جو چیچہ وطنی کے نواح میں ہے۔ اپنے ہونے والے بچے کے نام منتقل کر دیا۔ لیکن وہ زہرہ نوما نکلی اور بچہ پیدا ہونا تھا اور نہ ہوا' وہ فارم آج بھی اسی طرح موجود ہے۔ اس فارم کے مزارعین نے مسٹر بھٹو کے نام نہاد زرعی اصلاحات کے دور میں متعدد درخواستیں دیں کہ اس فارم کا کوئی مالک نہیں ہے ہمیں الاٹ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ان کی صدائے بازگشت بورڈ آف ریونیو تک پہنچی لیکن کچھ نہ ہوا۔ بھاری بھرکم فائل آج بھی کالونی اسسٹنٹ ساہیوال کے دفتر میں موجود ہے۔ لیکن ایک جگہ پر اٹکی اور جمی ہوئی ہے کیونکہ وہ کمشنر صاحب اب اور بھی اونچے عہدے پر چلے گئے ہیں' یہ فارم جس کا نام موصوف کے ہونے اور بعد میں نہ ہونے والے بچے کے نام پر حسن فارم ہے۔ آٹھ مربع انتہائی برموقع اور قیمتی اراضی پر مشتمل ہے جو چیچہ وطنی شہر اور راوی پل کے درمیان پختہ سڑک پر واقع ہے۔ جب کہ مزارعین کی تحریک کو ناکام بنانے میں ایک سابق رکن سینٹ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مزارعین کے لیڈر بھی جنہیں خرید لیا گیا اور وہ بیٹھ گئے اور یہ ساری بات اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ساہیوال کے ذاتی نوٹس میں ہے''۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے پاکستان میں ملکیت اراضی کے مسئلہ کے متعلق کہا تھا کہ آج یہ تحقیق کرنا سخت مشکل ہے کہ کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی اور آیا وہ شرعاً جائز نوعیت کی تھی یا ناجائز نوعیت کی' لیکن ۱۹۸۶ء میں جناب محمد اکرم قریشی صاحب جو ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی کی زرعی کمیٹی کے رکن تھے ''اسلامی بندوبست اراضی کی ضرورت'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ لاہور کے شمارہ ۴ جنوری ۱۹۸۶ء میں اپنے مضمون میں ۱۸۹۶ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا کہ اس کتاب کے ذریعے اب ایسے امور سامنے آئے ہیں جن کی بنا پر مسئلہ کی نوعیت شرعاً بدل جاتی ہے۔ ان کے مضمون کے اہم حصے ملاحظہ ہوں۔

''آج جو بڑی بڑی زمینداریاں قائم ہیں دیکھا جائے تو اسلامی اصول ملکیت اراضی کے جواز کے تحت یہ بڑی بڑی زمینداریاں وجود میں آ ہی نہ سکتیں تھیں جو یہ ہیں۔

(۱) جو مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اس کا مالک ہے۔ (اصول آبادکاری فرمودہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

(۲) جو زمین حلال آمدنی سے قیمتاً خریدی جائے (قانون بیع)

(۳) جو ایک اسلامی حکومت بطور عطایا دے (اصول عطا یا سرکار)

(۴) جو رقبہ ایک جائز مالک کسی دوسرے کو ہبہ کرے (قانون ہبہ)

(۵) جو اراضی جائز مالکوں کے جائز وارثوں کو اسلامی قانون وراثت کے تحت ملے (قانون وراثت)

اس سے بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ موجودہ صورتحال محض انگریز کی سامراجی حکمت عملی کے تحت پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ اسلامی اصولوں کے تحت ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ بحیثیت رکن زرعی کمیٹی جماعت اسلامی پاکستان اسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کا موقع بھی ملا مگر اب مسٹر ایس ایس تھارن برن صاحب کی ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی کتاب ''پنجاب کے مسلمان اور مہاجن'' نظر سے گزری ہے جس میں ملکیت اراضی اور ابتدائی بندوبست اراضی کے متعلق ایسے امور سامنے آئے جن سے مسئلہ کی نوعیت شرعاً بدل جاتی ہے۔

مسٹر ایس ایس تھارن برن صاحب ۱۸۹۶ء تک

پنجاب سول سروس میں اٹھارہ سال تک خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ کئی اضلاع کا بندوبست خود ان کے ہاتھوں سے سرانجام پایا اس لیے ان کی شہادت ایک واقف حال کی شہادت ہے۔ ان کی اس کتاب کا منشاء پنجابی مسلمان زمینداروں کو مہاجنوں کی گرفت سے بچانا ہے اور ان کی سفارشات کے مطابق ۱۹۰۱ء میں بالآخر پنجاب میں قانون بھی پاس ہوا۔ چنانچہ وہ ابتدائی حالات بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

طوائف الملوکی...... ''شہنشاہ اورنگزیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے لے کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مغربی پنجاب (موجودہ پنجاب اور سرحد) کو فتح کرنے (۱۸۲۳ء) تک یہ علاقہ کسی مرکزی حکومت کے کنٹرول میں نہ تھا۔ ہر علاقہ کا ایک متحدہ قبیلہ اپنی اجتماعی طاقت یا مناسب حالات پیدا ہونے پر تمام کمزور قبیلوں اور ذاتوں پر حکومت کرتا تھا۔ تقریباً وہی صورت حال تھی جو آج (۱۸۹۶ء) میں شمال مغربی سرحد کے ساتھ آزاد قبائل کی ہے۔ (صفحہ۴۲) یہ سکھوں کے دور سے پہلے کی بات ہے جب کہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول کارفرما تھا۔ اس لیے طاقت ور کے لیے دوسروں کی زمین پر قبضہ کرنا معمولی بات تھی۔ جب کوئی حکومت ہی نہ تھی تو ریکارڈ کہاں ہوگا۔

تمام اراضی مملکت (سٹیٹ) کی ملکیت تھی......

''تمام ہندوستان (ہندوپاک) میں مملکت (سٹیٹ) ہی بنیادی طور پر مالک اراضی تھی۔ اس لیے اس کا اولین حق یہ تسلیم کیا جاتا رہا کہ وہ کاشت کاروں کی پیداوار میں سے نصف یا زیادہ لے لے۔ دو ہزار سال سے ہر اس حکومت کے لیے جس نے اس جزیرہ نما کے کسی حصہ پر کبھی حکومت کی یہ اصول غیر متنازعہ رہا۔ (صفحہ۴۳)

''سکھوں کے دور میں یہ ہوا کہ جس اصول کے تحت مالیہ کا نظام قائم تھا اس کو انہوں نے مزید وسعت دے کر مملکت کے حق کو ہر قسم کی زرعی پیداوار تک بڑھا دیا''۔ دوسرے لفظوں میں مملکت (سٹیٹ) بالآخر (الٹی میٹ) نہیں بلکہ بلاشرکت غیرے مالک اراضی (لینڈلارڈ) تھی۔ صفحہ۴۳۔

اس سے معلوم ہوا کہ مملکت (سٹیٹ) عرصہ دو ہزار سال سے لے کر سکھوں کے دور تک مالک اراضی تھی۔ دوسرے منتظم تھے یا کاشت کار' مالک بہرحال نہ تھے۔

موجودہ مالکانہ حقوق انگریزوں کے تفویض کردہ ہیں۔ ''ہماری (انگریزی) حکومت کے قیام سے پہلے لوگوں کے پاس ہمارے تصور حقوق جائیداد کے مطابق زمین کے مالکانہ حقوق نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ شاید ہر معاشرہ کے ابتدائی دور میں ایسا ہوتا رہا۔ خصوصاً ہندوستان (ہندوپاک) میں تو یہی صورت تھی (صفحہ۴۳)۔

بندوبست اراضی کیسے ہوا......

''میں یقین رکھتا ہوں کہ معاملات کی کثیر تعداد ایسی تھی جن میں پرانے قابضان نے طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی جاگیروں (اسٹیٹس) پر دوبارہ قبضہ جما لیا۔ مگر اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ زمین پر ان کے حق کو ناقابل منسوخ سمجھتے۔ بلکہ باہر سے آ کر کسی کا زمین پر قبضہ کرنا درحقیقت ایک لمبے عرصے کی بددیانتی پر مبنی کارروائیوں کا نتیجہ تھا اور اس طرح قدیمی قابض کو غیر منصفانہ طور پر تباہ کر دیا جاتا تھا۔ (صفحہ۶۷)۔

''شروع میں سرسری بندوبست ہوا۔ اس میں دیہات کی حدبندی کی گئی۔ یہ بندوبست (سمری سیٹلمنٹ) چونکہ مالیہ کی تشخیص کی غرض سے کیا گیا تھا اس لیے قبضہ اور عرصہ کاشت کے سلسلہ میں مستند تحقیقات نہ کی جا سکیں جیسا کہ حق تھا جو شخص قابض پایا گیا مالک قرار دے دیا گیا۔ (صفحہ۴۷)۔

''پنجاب (موجودہ پنجاب اور سرحد) کے مسلم اضلاع میں پہلا بندوبست اراضی ۱۸۷۱ء میں ہوا۔ (جبکہ قبضہ

۱۸۴۹ء میں ہوا) اور آخری ضلع کوہاٹ میں ۱۸۹۶ء میں ہوا۔ جس سست رفتاری سے مغربی اضلاع میں یہ کام مکمل کیا گیا۔ اس سے بااثر قبیلوں خاندانوں اور زیرک اشخاص کو ملکیت اراضی کے حصول میں بڑی مدد ملی۔ حالانکہ الحاق پنجاب کے فوراً بعد تحقیقات کی جاتیں تو ان میں اکثر موجود ہی نہ تھے۔ یا قبضہ کا تسلسل مفقود ہوتا یا وہ محض مالیہ جمع کرنے والے تھے (صفحہ ۴۸)۔

ان باتوں سے ظاہر ہے کہ ہندوپاک میں ریاست ہی مالک اراضی تھی۔ موجودہ حقوق ملکیت (انگریزوں نے قائم کئے اور جس طرح قائم کئے ان کی وضاحت بھی دی گئی۔ یہ اس لیے بھی قابل فہم ہے کہ پاکستان بننے کے بعد مکانوں اور جائیدادوں کی الاٹ منٹ میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے کا واقعہ ہے۔ حالانکہ اس وقت ہر چیز کا ریکارڈ موجود تھا۔ اس سلسلہ میں وہ مزید لکھتے ہیں:

''جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن گیا تو ہمارے اولین منتظمین کی ذمہ داری امن بحال کرنا اور مالیہ کی وصولی کو محفوظ بنانا تھا۔ اس وقت حق قبضہ یا مدت کاشت کی تحقیقات کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ نہ ہی وہ وقت آیا تھا کہ جب ان تحقیقات کا کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا۔ زمین بہت تھی کاشت کار کم تھے۔ ''انفرادی حق ملکیت'' کی اصطلاح کا ابھی ادراک ہی نہ تھا۔ جو حقوق سمجھے جاتے تھے وہ گاؤں یا قبیلہ کے مشترکہ تھے۔ اس طرح الحاق کے کچھ سال بعد بااثر قبائل اور خاندانوں کو مزید مہلت مل گئی کہ وہ اپنے حقوق کو مستحکم اور قانونی بنا سکیں۔ جو جبراً حاصل کئے گئے تھے۔ (صفحہ ۴۶)۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے معززین......

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لینے والے نوابوں' سرداروں اور قبیلوں کا جو عبرت انگیز حشر کیا گیا جس طرح ان کی جائیدادیں ضبط کر کے انہیں پھانسیاں دی گئیں وہ تاریخ کا ایک المناک اور دردناک باب ہے۔ مگر اس وقت جن سرداروں اور نوابوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا ان کو جس طرح نوازا اور سراہا گیا اس کی تفصیلات بھی ریکارڈ میں موجود ہیں۔

ضلع ساہیوال کے گزیٹیئر ...... برائے سال ۱۹۳۵ء میں انگریز افسر بڑے فخر سے تحریر کرتا ہے کہ......

''کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ معززین جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں سرکار کا ساتھ دیا تھا اور وفادار رہے تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ضلع میں بااثر اور نمایاں ہیں''۔

ظاہر ہے کہ جب کچھ خاندانوں کو ہزاروں ایکڑ رقبہ دے کر عام لوگوں پر بہت بڑی معاشی برتری دے دی گئی ہو تو ان کا مقتدر اور بااثر ہونا فطری امر ہے۔ آج ۱۹۸۵ء میں بھی صورتحال مختلف نہیں ہے۔ ہر ضلع میں جن خاندانوں کو نوازا گیا تھا آج بھی وہ بااثر ہیں۔ جس طرح ۱۸۵۷ء میں سامراجی حاکموں سے مل کر انہوں نے جنگ آزادی کو ناکام بنایا تھا۔ آج بھی وہ اسلام کا راستہ روکے ہوئے ہیں اور عوام کو جمہوریت اور آزادی سے ہی نہیں بلکہ عزت آبرو سے بھی محروم رکھنے پر بضد ہیں۔

کیا یہ ستم ظریفی اور سنگین مذاق نہیں ہے کہ کچھ خاندانوں کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی ہو اور لاکھوں کاشتکاروں اور محنت کاروں کے پاس چند مرلہ کا ذاتی مکان تک نہ ہو۔

ضرورت ہے کہ ملکیت اراضی کے نظام کو درست کرنے کے لیے از سر نو اسلامی بندوبست اراضی عمل میں لایا جائے۔ اگر قدیم سے اراضی مملکت کی ملکیت تھی اور موجودہ حقوق ملکیت ایک کافر اور سامراجی حکومت نے دیئے تھے تو ایسی اراضی جات عطایا اور جاگیروں کے ذیل میں آتی ہیں تو یہ ناجائز مقاصد اور نامناسب مقدار میں دیئے گئے عطایا ایک اسلامی حکومت بلا کسی شرعی رکاوٹ واپس لے کر اصل

حق داروں یا ضرورت مندوں کو دے سکتی ہے۔

انگریزی حکومت کے دور میں ان بڑے زمینداروں کو ماضی کی طرح کوئی فوج مہیا نہ کرنی ہوتی تھی جس کے اخراجات ان کو برداشت کرنے پڑتے۔ اس لیے یہ لوگ اپنے اردگرد کے لوگوں سے بے تحاشا زیادہ معاشی برتری سے مملکت کے اندر مملکت کی صورت اختیار کرتے گئے۔ اب تقریباً سو سال تک ان اراضیات سے بھرپور استفادہ کے بعد یہ اپنی نام نہاد خدمات کا معاوضہ خوب خوب وصول کر چکے ہیں۔ اس لئے ان سے اراضیات واپس لے لینا ہرگز زیادتی نہیں ہے۔ انہوں نے الا ماشاء اللہ جس طرح انسانوں کے حقوق پامال کئے زیردستوں کو جس طرح من مانیوں کا نشانہ بنایا اور تا حال بنا رہے ہیں اس کی پاکستان کے قیام کے بعد سے احتساب کی ذمہ داری حکومت پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے اس دور کے ظلم و جور کی سزا ضرور ملنی چاہئے''۔ (اقتباسات ختم)

اب جب کہ زمینوں کے متعلق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ موجودہ حقوق ملکیت ایک کافر اور سامراجی حکومت نے دیئے تھے تو اب اسلامی بندوبست اراضی کے مطابق تمام زمینوں کو اجتماعی فلاح و پرورش کے لیے اسلامی حکومت کی تحویل میں (امانتاً) دینے کے اصول پر عمل کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر افراد معاشرہ کو روزگار تک بھی فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کا احساس مودودی مرحوم کو بھی تھا، فرماتے ہیں ''اسلام معاشرے اور ریاست کے ذمہ یہ فرض عائد نہیں کرتا کہ وہ اپنے افراد کو روزگار فراہم کرے۔ اس لیے کہ فراہمی روزگار کی ذمہ داری بغیر اس کے نہیں لی جا سکتی کہ ذرائع پیداوار پر اجتماعی قبضہ یا نازی طرز کا تسلط ہو اور اس کی غلطی اور مضرت پہلے بتائی جا چکی ہے (اسلام اور جدید معاشی نظریات صفحہ ۱۳۵) لیکن اب جبکہ مسئلہ کی نوعیت (بعد از تحقیق) شرعاً بدل چکی ہے۔ اس لیے اب بے روزگاری اور دیگر مسائل کے خاتمہ کے لیے زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کو اجتماعی فائدے کے لئے اجتماع کی تحویل میں دے دینا نہ غلط ہے اور نہ مضر بلکہ ضروری ہے۔

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لئے خوشخبری

(نایاب) آسان قرآن مجید (نیوز)، مع تفسیر القرآن بالقرآن از۔ تلمیذ سرسید جناب علی احمد خان دانشمند جالندھری (علیگ)

رعایتی قیمت پر =/200 روپے کی بجائے صرف =/100 روپے میں طلب کریں (علاوہ ڈاک خرچ)

مذکورہ تفسیر کے آخری پارہ کے چند نوٹس ملاحظہ ہوں۔

''سورۃ عبس (آیات 1-16) عام طور پر اس سورۃ کا غلط ترجمہ کر کے اسے پیغمبر ﷺ کی طرف منسوب کیا ہوا ہے۔ درآنحالیکہ یہ تو ایک روحانی اندھے کافر کے لئے ہے۔ مومن اندھے کے لئے نہیں ہے۔ نہ پیغمبر ﷺ نے مومن اندھے کے لئے تیوری چڑھائی نہ پیٹھ پھیری۔ یہ تمام حرکات تو روحانی اندھے کافر کی ہیں۔ سورۃ المدثر میں بھی ایسے ہی روحانی اندھے کافر کی حرکات ہیں۔ دشمن قرآن نے بہت سی جھوٹی روایات بنا بنا کر قرآن حکیم کی روشنی پر سیاہ غلاف چڑھانا چاہا ہے لیکن سورج پر کون سیاہ غلاف چڑھا سکتا ہے''۔

''سورۃ الفیل آیات (1-5) پس مکہ معظمہ کے دانائے کار جرنیل حضرت عبدالمطلب نے اپنے ہمراہ تمام اہل مکہ کو لے کر جس کا ہر فرد ایک جانباز سپاہی تھا مکہ کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور اصحاب فیل پر اچانک ایسا سخت جوابی حملہ کیا کہ ہاتھیوں نے اپنی فوج کو خود ہی روند ڈالا۔ پھر کیا تھا نہ ابرہہ اور نہ اس کی فوج کا ایک فرد زندہ بچ کر نکل سکا۔ سورۃ یٰسین کی آیات 14 تا 30 دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی گمراہ قوم کو عذاب دینے کے لئے کبھی آسمان سے لشکر نہیں اتارے اور نہ وہ اتارنے والا ہے''۔

ملنے کا پتہ :- مکتبہ اخوت، الکریم مارکیٹ، سیکنڈ فلور، اردو بازار، لاہور۔

قرآں کے اثر کو روک دینے کے لئے
ہم لوگوں پہ راویوں کا لشکر ٹوٹا

(اکبر الہ آبادی)

علامہ اسلم جیراجپوری کی خوبصورت اور فکر انگیز کتاب

ہمارے دینی علوم (علم تفسیر، تفسیر بالروایت، علم حدیث، علم فقہ) قیمت 75 روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

☆ ملنے کا پتہ ☆ مکتبہ اخوت، الکریم مارکیٹ، سیکنڈ فلور، اردو بازار، لاہور۔

Safety Sealers *for*

FULL PROTECTION

From Foundation to Roof Top

Dampcourse Sheeting 13" & 9" to BS 6398:83

Damp Wall Coating to ASTM D-2822

Sealocrete Waterproofing Powder & ADMIXTURES

Oxy Bit Range of Oxidised Bitumens

Roofing Felts to BSS & ASTM SPEC

Safetorch 3 to 5 MM Torch on Membranes

Joint Sealants for Buildings & Structure Water Retaining

Jet Fuel Resistant Sealing for Runways

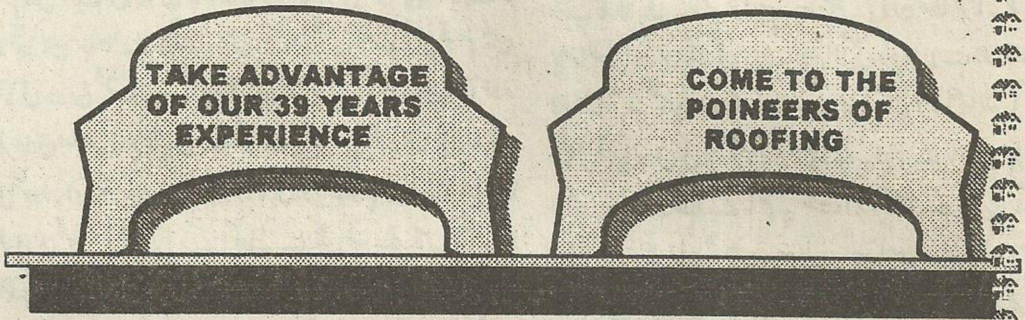

SAFETY SEALERS (PVT) LTD.

Ist Floor Galaxy Shopping Centre, 115-Ferozepur Road, Lahore-Pakistan
Tel Office:417254-7573615
KARACHI OFFICE:2/13-A, Commercial Area, P.E.C.H.S.
Karachi-Pakistan Tel:4944059
QUETTA: 12 A Nursery Lines
Ph:836778

نقطہ نگاہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حسنین سعید ایڈووکیٹ

عید محکوماں، ہجوم مومنین

ہر متمدن ملک و مہذب قوم کے طرز زیست میں یہ دستور بالعموم پایا جاتا ہے کہ سال میں چند ایام ان کی تاریخی و مذہبی اہمیت کے پیش نظر مخصوص انداز میں منائے جاتے ہیں۔ ان ایام کی تقریبات میں ہر قوم اپنی فکر معاش اور روٹین لائف سے ہٹ کر اپنی ملکی و قومی روایات کے مطابق اجتماع کی ایک صورت پیدا کر لیتی ہے۔ جب تک کسی قوم میں اجتماعی روح قائم رہتی ہے اور اجتماعیت کے فائدوں کا احساس قوم کے افراد میں موجود ہوتا ہے اس وقت تک ایسے اجتماعات میں افادیت کا پہلو غالب رہتا ہے۔ زندہ اقوام میں یہ تہوار ساری قوم میں ایک نئی روح پھونکنے اور نیا جوش عمل پیدا کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جب کسی قوم میں اجتماعی روح ختم ہو جاتی ہے تو خود غرضیوں کی نفسا نفسیاں' اور انفرادی مطلب پرستیاں معاشرے پہ غالب آ جاتی ہیں۔ پھر یہی تہوار اور تقریبات قوم کو اجتماعی فوائد پہنچانے کے بجائے انفرادی نمود و نمائش کے اکھاڑے بن جاتے ہیں۔ ایسے اجتماعات روح سے عاری ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی محض فرض مشابہہ قرض کی حیثیت سے معاشرے میں نمود و نمائش کا موثر ذریعہ سمجھ کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ معاملہ یہاں پہ پہنچ کر ان اجتماعات کے ساتھ عوام کی دلچسپی و وابستگی ختم کر دیتا ہے جن سے یہ اجتماعات محض چند گروہوں تک محدود ہو کر بالعموم بے رونق و بے کیف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ لوگ اکٹھے ہوں بھی تو ایک بے مقصد ہجوم کی حیثیت سے اکٹھے ہوتے ہیں۔ غرض اجتماعی شان و شوکت کے ولولوں کے بجائے انفرادی بے دلی کا ہر فرد شکار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی عید الاضحیٰ منانے کا مقصد قوم میں اخوت' بھائی چارہ و قربانی کی فضا قائم کرنے کا ہے لیکن ایسا جذبہ وطن عزیز میں کہیں پر بھی' کسی بھی اجتماع میں نظر نہیں آتا۔

جب سرور کائناتؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ مدینہ کے لوگ سال میں دو دن مناتے ہیں بعض روایات کے مطابق یہ دن نو روز اور مہر جان تھے۔ آپؐ کے استفسار پہ لوگوں نے بتایا کہ ان دنوں ہم ایام جاہلیت میں کھیلا کودا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ رب کائنات نے تم کو ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں وہ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ ہیں۔ یوم الاضحیٰ وہ دن ہے جو موحد اعظم ابراہیمؑ (خلیل اللہ) اور حضرت اسماعیلؑ (ذبیح اللہ) کی بے مثال قربانیوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ ہمارے ہاں یوم الاضحیٰ کو لاکھوں جانور خدا کے نام پہ سنت ابراہیمی کے اتباع کے لئے ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یوم الاضحیٰ کے دن گوشت تقسیم کرنا ہی اصل مقصد ہے یا پھر قربانی کا مطلب کسی جانور کو ذبح کر کے خوب گوشت کھانا اور کھلانا ہے اور سب سے اہم پہلو سوال زیر غور کا یہ ہے کہ قربانی کس حوالے سے ازروئے قرآن یا حدیث مسلم امہ پہ فرض یا واجب ہے؟ نیز یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی طریقہ سے انفرادی طور پہ جانور ذبح کر کے یوم الاضحیٰ مناتے ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو یہ دن منانے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کا ثبوت حدیث رسولؐ سے ملتا ہے۔ اس لئے قربانی کو سنت نبوی کہا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا حکم قرآن پاک میں ہوتا تو اس کی شرعی حیثیت فرض کی سی ہوتی۔ یہاں پہ ایک امر خاص طور پہ قابل ذکر ہے کہ قربانی کے متعلق متعدد احادیث پیش کی جاتی ہیں جن میں سے زیادہ کو جمہور فقہاء کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس میں سب سے مستند حدیث جس سے فقہاء قربانی کا جواز لاتے ہیں وہ حضرت علامہ شوکانیؒ کی تصنیف ''نیل الاوطار'' کی جلد پنجم سے لی جاتی ہے۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ

''حضرت ابورافع سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے قربانی کا ارادہ فرمایا تو آپؐ نے اس مقصد کے لئے دو موٹے تازے صحت مند دنبے خریدے۔ عیدالاضحیٰ کے دن آپ نے سب سے پہلے نماز عید ادا کی پھر لوگوں کو خطبہ دیا۔ آپؐ ہمیشہ جانور عیدگاہ میں ذبح کرتے تھے۔ آپؐ نے پہلا دنبہ ذبح فرمایا تو کہا کہ یہ میری امت کی جانب سے ہے اور دوسرا ذبح ہوا تو ارشاد ہوا کہ یہ میری طرف اور میرے پورے خاندان کی طرف سے ہے''۔

واضح ہو کہ اس حدیث کے راوی علی بن حسین ہیں جن کا تعلق خاندان رسولؐ سے تھا۔ علی بن حسین حدیث متذکرہ کے ضمن میں مزید فرماتے ہیں کہ بنی ہاشم کا تمام خاندان رسولؐ کی اس قربانی کو اپنے لئے کافی سمجھتا تھا اور سارے خاندان میں آپؐ کے علاوہ کوئی اور قربانی نہیں کرتا تھا۔ ستم یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس حدیث کا پہلا حصہ تو بیان کر دیا جاتا ہے لیکن اس کے دوسرے حصہ پہ پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یوں قربانی کو ہر صاحب نصاب کے لئے فرض قرار دے کر اسلام کے نام پہ ایک ہی دن میں لاکھوں جانور ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ چونکہ ان جانوروں کی کھالیں ہمارے ہاں کے دینی مدرسوں کو بطور عطیہ ملتی ہیں اس لئے ہمارے علماء کرام قربانی بذریعہ جانور کو غیر ضروری قرار دے کر خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارنا نہیں چاہتے۔ لیکن اگر ایک دن میں لاکھوں جانوروں کو ذبح کرنے کا نقصان اگر آپ دیکھیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی۔ لیکن نقصانات سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ قربانی کے معاملہ میں صحابہ کرامؓ کا طرز عمل بھی بیان کر دیا جائے تا کہ بات مزید واضح ہو سکے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے تمام عمر باوجود استطاعت کے قربانی نہ کی اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ اس طرح لوگ قربانی کو ضروری خیال کر لیں گے۔ اب خلفاء راشدینؓ سے بہتر علم کس کے پاس ہے۔ اگر قربانی فرض ہوتی یا ضروری ہوتی تو یہ احباب ضرور قربانی کرتے۔ خلفاء راشدین عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کو نفلی عبادت قرار دیتے ہیں جس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اگر یہ عبادت کی جائے تو اس کا ثواب ملتا ہے اور اگر نہ کی جائے تو کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ حضور پاکؐ نے زندگی بھر ایک قربانی کی۔ ہمارے ہاں جن احادیث کو بیان کیا جاتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے ہر سال قربانی کی اور قربانی کرنے کا حکم صادر فرمایا ان احادیث کو فقہاء کرام نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ کی قدر و منزلت سے ہر مسلمان واقف ہے۔ انہوں نے قربانی کے دن ایک مرغ ذبح کیا۔ لوگوں کے استفسار پہ آپ نے فرمایا کہ میرے لئے قربانی کی قیمت سے کسی مسلمان بھائی کی ضرورت کو پورا کرنا' جانور ذبح کرنے سے بہتر ہے۔ ایک اور صحابی ابو مسعود انصاریؓ تھے۔ ان کے گھر میں ہر وقت ہزاروں بھیڑ بکریاں موجود رہتی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پہ کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے عمل کی وجہ یہ بتائی کہ کہیں عام لوگ قربانی کو ضروری نہ سمجھ لیں۔ درج بالا مختصر شواہد سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قربانی فرض نہیں بلکہ صاحب نصاب پہ بھی نفلی عبادت ہے۔ اب آخر میں قربانی کا معاشرتی نقطہ نظر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

آج کل ہمارے ہاں قربانی کے ذریعہ جو نمود و نمائش کی جاتی ہے اور امراء جس طرح غرباء کی تضحیک کرتے ہیں وہ بھی قابل غور پہلو ہے۔ ہر سال ہم لاکھوں جانور ذبح کر کے دین کی اور معاشرے کی کونسی خدمت کرتے ہیں۔ سال میں ایک دن غریب اور محتاج کو گوشت کھلا دینے سے اس کا کونسا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ جبکہ لاکھوں جانور ذبح کرنے سے ہوتا یوں ہے کہ جانور اچانک کم ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہر سال گوشت کے نرخ بڑھ جاتے ہیں۔ آج بھی وطن عزیز میں گوشت ۱۲۰ روپے کلو بک رہا ہے۔ جبکہ ایک عام مزدور کی دیہاڑی ۷۰ سے ۱۰۰ روپے کے درمیان ہے۔ اس کا ایک اور قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے اور زرعی ملک میں جانور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے ہاں ڈیری روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ جس کے باعث ہماری زرعی معیشت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ پہلو بھی ارباب عقل ونظر کے لئے باعث فکر ہے۔ انہی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے مراکش کے شاہ حسین نے ۱۹۸۰ء میں ایک حکمنامہ جاری کیا کہ اس سال ملک میں ایک بھی جانور ذبح نہیں کیا جائے گا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلامی حکومت ہونے کے باعث شاہ مراکش کے جاری کردہ حکم کو شرعی فتویٰ سمجھا جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے میں بے شمار ایسے کام ادھورے ہیں جو کہ کسی کی توجہ و مالی معاونت کے منتظر ہیں۔ قربانی کی رقم خاموشی سے کسی غریب نادار طالب علم کو بطور وظیفہ دی جائے تو شاید اس کا مستقبل سنور جائے۔ اس سے بڑھ کر دین کی اور معاشرے کی اور کیا خدمت ہوگی اسی طرح جہیز اور مالی وسائل نہ ہونے کے باعث ہزاروں نوجوان لڑکیاں اپنے والدین کے گھروں ہی میں بوڑھی ہو جاتی ہیں اس رقم کو وہاں استعمال کر کے زیادہ فائدہ اور زیادہ ثواب کمایا جا سکتا ہے۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو کئی معاشرتی اور سیاسی مسائل آپ کی نظر میں آئیں گے جہاں پہ قربانی کی رقم کو بطور عبادت خرچ کرنا بہ نسبت جانور ذبح کرنے کے زیادہ مستحسن ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آج بھی متعدد عرب ممالک میں ایک قبیلہ اور ایک محلہ میں ایک ہی قربانی کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں مولوی حضرات قربانی کو حج کا رکن گردانتے ہیں۔ حالانکہ حج قربانی کے بغیر بھی ہو جاتا ہے۔

آخر میں عرض کروں گا کہ زندہ قومیں اپنے عمل کی ٹھوس حقیقت پہ ایمان رکھتی ہیں وہم پر نہیں۔ ایک حال پہ نہ رہنے والی قومیں حرکت وعمل پر اپنے اعمال وحیات ملی کی بنیاد رکھتی ہیں اور یہی وہ زندہ قومیں ہیں جن کے ہر اجتماع، ہر تقریب، ہر جلسہ (خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشرتی) سے زندگی اور ملی یکجہتی کی پرنور شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنے مذہبی تہواروں کے فلسفہ کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے اور ان تہواروں کو اس طرح منانا چاہئے کہ ان کا مقصد بھی فوت نہ ہو اور ملک و معاشرہ کے لئے سنگین مسائل بھی پیدا نہ ہوں۔ شاعر مشرقؒ نے شاید اسی لئے محکوم و آزاد کی عید میں بھی فرق بیان کیا تھا کہ

عید آزاداں شکوہ ملک و دین
عید محکوماں، ہجوم مومنین

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلہ طلوع اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 180 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

70, 72, 73, 75, 76, 77, 78, 83, 84, 85, 86, 87, 88, 91, 94, 95, 96, 97, 99, 2000

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈاکٹر حبیب الرحمن خان، ایم، ڈی
صدر ادارہ فکر اسلامی، کراچی

ایک اہم کانفرنس کا ذکر

بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں جا کر پہنچی!

میں پاکستان (PCSIR) کی سائنٹیفک کونسل کا میڈیکل کنسلٹینٹ ہوں۔ ۱۹۸۳ء کا ذکر ہے کہ ایک سینئر سائنٹسٹ ڈاکٹر قریشی صاحب اسلام آباد سے اپنے معائنہ کے لئے تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ ایک سال بعد وہ ریٹائر ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر قریشی صاحب کوئی ایسا کام کر جایئے کہ یاد کئے جائیں۔ انہوں نے فرمایا کیا کروں؟ میں نے عرض کیا کہ پوری دنیا سے مسلم سائنٹسٹس کو پاکستان مدعو کیجئے۔ انہوں نے کہا آپ کا خیال زبردست ہے اور میں نے انہیں راضی کیا کہ اپنی منسٹری کے ذریعے صدر جنرل محمد ضیاء الحق کو لکھئے۔ جناب صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اس وقت پاکستان کے صدر تھے۔ انہوں نے صدر جنرل ضیاء صاحب کی خدمت میں لکھا۔ ضیاء الحق صاحب فوراً راضی ہو گئے۔ پوری دنیا کے مسلم سائنس دانوں کو دعوت نامے روانہ کئے گئے۔ ۱۲۰۰ (بارہ سو) مسلم سائنسدان آنے کے لئے تیار ہوئے اور اپنے مضمون (مقالے) بھی لکھنے کو تیار ہو گئے۔

اب باقاعدہ حکومت پاکستان کی طرف سے دعوت نامے چھپ گئے جو مجھے بھی ملا۔ میں نے ڈاکٹر قریشی صاحب کو لکھا کہ میں نہیں آ رہا ہوں۔ میرا خط ملنے پر انہوں نے فون پر دریافت کیا کہ اس خیال کی ابتداء آپ نے کی اور آپ شریک نہیں ہو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ باقاعدہ لکھ کر مجھ سے پوچھئے۔ ان کا خط آیا میں نے اس کا جواب چھ صفحات پر لکھ کر صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں روانہ کیا میں نے لکھا کہ اگر ان نامی گرامی سائنسدانوں کو جو ماشا اللہ بارہ سو ہیں آپ صرف ان کے مقالے سننے کے لئے بلوا رہے ہیں تو میرے بھی دو (مضمون) ہیں وہ بھی کوئی صاحب پڑھ دیں۔ لیکن اگر ان سے پورا فائدہ اٹھانا ہے تو ان کے پڑھنے کے بعد بھی آپ انہیں ۳۔۴ روز مزید ٹھہرائیں۔ اور ان کو یہ Terms of Reference یا نصب العین دیں کہ وہ پہلے اپنی اپنی Speciality کی علیحدہ علیحدہ نشستیں (Meetings) کروائیں اور اس میں ایسی باتوں پر غور کریں۔

(۱) ہر ایک Speciality میں اسلامی ممالک کہاں کھڑے ہیں؟ امریکہ اس میں کہاں کھڑا ہے۔ روسی، جاپانی، تیوانی کہاں کھڑے ہیں۔

(۲) آپ کی Speciality میں اسلامی ممالک میں کتنے سائنسدان ہیں، کتنے Technicians ہیں۔ کتنے آلات ہیں؟

(۳) ہر سال سائنس کے سلسلے میں اسلامی ممالک کتنا خرچ کرتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں ترقی یافتہ ممالک کتنا خرچ کرتے ہیں اور ان کے یہاں کتنے آلات اور سائنسدان ہیں۔

(۴) اب آپ کی کوششوں سے (منصوبوں سے)، کتنے

پیسے کی مدد سے اور کتنے آلات کی مدد سے دنیاء اسلام کو اپنے شعبوں میں ایک سال میں کہاں تک لے جایا جا سکتا ہے۔ ۲ سال میں کہاں تک لیجا سکتے ہیں۔ ۵ سال میں کہاں تک ترقی دے سکتے ہیں۔

یہ خط میں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا اور ایک کاپی سائنس منسٹری میں ڈاکٹر قریشی صاحب کو روانہ کی۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے اس خط کی تعریف کی اور منسٹری آف سائنس کو لکھا کہ کانفرنس دو حصوں میں ہو۔ ایک مقالہ پڑھنے اور سننے کے لئے اور دوسری نشست ان اہم موضوعات کے لئے وقف ہو۔

یہ کانفرنس اسلام آباد میں ہوئی اور آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ پورے Data کے ساتھ اور اہم تجاویز کے ساتھ یہ کانفرنس ختم ہوگئی۔

۳۔۴ ہفتے سے یہ میں نے لکھنا شروع کیا کہ اب کیا ہو گا؟ مجھے لکھا گیا کہ ایک ماہ بعد مسلم Muslim Foreign Ministers (وزراء خارجہ) کی کانفرنس میں یہ پیش کی جائیں گی۔ یہ مراحل بھی پایہ تکمیل کو پہنچے اور وہ سب چیزیں مکمل طور پر پاس ہو گئیں۔

ایک ماہ کے بعد میں نے پھر لکھنا شروع کیا۔ اب کیا ہو گا؟ مجھے لکھا گیا کہ مسلم سربراہان مملکت کی کانفرنس جو کاسابلانکا میں ہو رہی ہے اور ہمارے صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب ان تمام تجاویز کو اس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے پیش کریں گے۔ خدا کا شکر وہ تمام تجاویز وہاں بھی پاس ہو گئیں اور یہ بھی طے پایا کہ ایک سال کس کس مسلم ملک میں کیا کام ہو گا اور پھر مسلم ملک ہر سال اس کے کتنے اخراجات برداشت کرے گا۔ معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو کیا منظور تھا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب دنیا سے چلے گئے۔ دوسری حکومت آئی اور اس نے ان تجاویز کو کولڈ اسٹوریج میں ڈال دیا۔

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بڑا فضل و کرم ہے۔ میں ۱۹۵۴ء سے برابر صبح کی نماز کے بعد تلاوت کرتا ہوں۔ ۳ دن میں ایک پارہ ختم کرتا ہوں۔ میں صرف تلاوت ہی نہیں کرتا اس کا مفہوم بھی پڑھتا ہوں اور ذہن نشین بھی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اس کے مفہوم میں اتنی کشش ہے کہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ تو میں پڑھ چکا ہوں۔

جب بھی میں سورۃ حج پڑھتا ہوں۔ میرے ذہن میں یہ خیالات بار بار ابھر کے آتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے حج کا مقصد صرف انفرادی اور اجتماعی عبادت بتایا ہے یا عبادت کے علاوہ معاملات بھی ہیں۔

سورۃ حج کی ۲۷ اور ۲۸ آیات کے مفہوم میں لکھا گیا ہے:

جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ (اللہ نے ان کی زبان سے کہلوایا) (ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ اب) تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل و حجت (فیصلہ) کے لئے یہاں آیا کریں۔ دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے پاپیادہ یا اپنی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔ وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی یعنی بنی نوع انسان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ کھائیں بھی اور باہمی بحث و تمحیث سے وہ تدبیریں بھی سوچیں جن سے ان کی ملی زندگی کی تمام کثافتیں دور ہو جائیں، اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآء ہو سکیں۔ (جنہیں انہوں نے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھا ہے) اور اس طرح پوری کی پوری امت اس مقصد کی نگہبان بن جائے۔ جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدار خداوندی کا نشان ہے اور جسے اس باب میں شرف، اولیت اور سبقت حاصل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک حج کیا حجتہ الوداع میں جو

آپ نے فرمایا وہ ہمارے سب کے سامنے ہے۔ آپ نے اس وقت کے جملہ مسائل کا جو نوع انسان کو درپیش تھے ذکر فرمایا اور اس کے حل بھی پیش کیے۔

اسلام کی تاریخ سے میں اتنا واقف نہیں ہوں۔ میں آپ کے علم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا خلفاء راشدینؓ کے زمانے میں بھی عبادات اور معاملات دونوں کو سامنے رکھ کر بحث وتمحیص کے بعد خطبہ حج دیئے جاتے تھے یا نہیں! مجھے یقین کامل ہے کہ ایسا ضرور ہوتا رہا ہوگا۔

(ہماری تاریخ نامکمل ہے اور جو موجود ہے وہ ناقابل اعتماد)

کیا آج کل ہم فریضہ حج پورا کررہے ہیں؟

ہم کریں یا نہ کریں یہ زمانہ کے تقاضے ہمیں اس سمت میں مجبور کررہے ہیں۔ نہ بیت المقدس میں یہودیوں نے آگ لگائی ہوتی اور نہ او۔آئی۔سی (OIC) وجود میں آتی۔ کیا آج کل ان کی مختلف قسم کی نشستیں نہیں ہوتیں، کونسل کی میٹنگ...... وزراء خارجہ کی میٹنگ، مسلم ممالک کے سربراہان کی میٹنگ وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ ہمیں دھکے دے دے کر اسی طرف لا رہا ہے جو حج کا مقصد اور اس کی روح ہے۔

کیا یہ آج بھی ممکن نہیں کہ ہر حج کے ابتدائی ہفتہ میں پوری مسلم دنیا کے ایکسپرٹس، ماہر ہر شعبہ زندگی کے ایک جگہ خانہ کعبہ میں جمع ہوں اور اپنے شعبہ زندگی کے متعلق مسائل مسلمانوں کے بالخصوص اور انسانوں کے بالعموم کو سامنے رکھ کر ان کا حل تلاش کریں اور ان میں سے اولین ترجیح کے مسائل کا حل اکٹھا کریں اور اسی سنہ ہجری کے لئے اپنا نصب العین متعین کریں اور نو تاریخ کو خطبہ حج میں اس کا اعلان ہو اور دس تاریخ کو ہم جب عید مناتے ہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کو بالخصوص اور باقی دنیا کو بالعموم واقفیت ہو جائے۔

یہ خطبہ حج اتنا مکمل ہونا چاہئے کہ ہر مسلم ملک کو معلوم ہو جائے کہ اسے اس ہجری میں کیا کیا کرنا ہے۔ وہ سال بھر اسی پر عمل کریں۔ دوسرے سال اکٹھا ہوں اور رپورٹ دیں کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوئے اور کس حد تک کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ غور کریں کہ کامیاب کیوں نہ ہوئے اور پھر موجودہ مسائل کو سامنے رکھ کر دوسری ہجری کے لئے اپنا نصب العین متعین کریں۔ کوئی شعبہ زندگی ایسا نہ ہو جس کے ماہر Specialists حالات کو سامنے رکھتے ہوئے غور وفکر کر کے اپنا حل تلاش کرنے سے رہ جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو بڑی بڑی ذمہ داریاں دی ہیں کہ آپ انسانیت کی فلاح وبہبود کو سامنے رکھ کر سیدھے راستے پر خود چلیں اور انسانیت کو راہ دکھائیں۔

ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں ۱۹۹۳ء میں مجھے شکاگو میں Council of Parliament of World Religions میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ جس میں ساڑھے سات ہزار مختلف مذاہب کے لوگ شریک ہوئے تھے۔ ۲۵۰ مسلم Delegates تھے۔ سب پڑھے لکھے تھے عالم فاضل، لیکن کوئی مولوی نہ تھا۔ یہ دنیا کے ہر حصے سے تشریف لائے تھے۔ میں نے ان میں سے چند مخصوص صاحب علم اور ادب سے یہی سوال دہرایا کہ کیا حج کا مقصد صرف انفرادی یا اجتماعی عبادات تک محدود ہیں یا اس میں معاملات پر بھی غور وخوض ہونا چاہئے اور ان کے سامنے اوپر لکھی ہوئی باتیں بھی عرض کیں۔ اکثر حضرات نے جواب دیا کہ یہ ہم نے کہیں نہیں پڑھا لیکن آپ کی باتوں سے قرآن کی روشنی میں انکار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ سے درخواست ہے کہ قرآن کی اس سوچ کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیجئے اور انشاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب ہم اس پر عمل کر کے اپنا ایک عظیم فریضہ ادا کریں۔ سیدھے راستے پر چل کر ذمہ داریاں سنبھالیں اور انسانیت کو راہ دکھائیں۔ آمین ثم آمین۔

قارئین محترم

(1) ادارہ طلوع اسلام کا اکاؤنٹ نمبر 7-3082 نیشنل بنک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ 2 لاہور ہے۔

(2) اگر آپ (Direct) رقم ادارہ کے اکاؤنٹ میں بھیجیں تو اد رہ کو اس رقم کے بارے میں اطلاع دیں کہ کون سے بنک کی وساطت سے رقم بھیج رہے ہیں اور کتنی رقم ہے۔ نیز وہ رقم کون سے فنڈ کے لئے ہے تاکہ اس کے بارے میں بروقت معلوم کیا جا سکے۔

(3) اگر آپ لوکل شمارہ کے لئے رقم مبلغ -/170 روپے بھیج رہے ہیں تو آپ برائے مہربانی ڈرافٹ بنوا کر بھجوائیں تاکہ بروقت اسے ادارہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرایا جا سکے۔ اگر آپ لاہور سے باہر کسی دوسرے شہر کا چیک ارسال کرنا ہی مناسب سمجھیں تو درج ذیل حساب سے رقم ارسال کریں۔

(i)	شمارہ ایک سال کے لئے	170 روپے
(ii)	بنک چارجز	70 روپے
	کل رقم	240 روپے

(4) میگزین کے لفافہ پر جہاں آپ کا ایڈریس درج ہوتا ہے اوپر یہ عبارت درج ہوتی ہے **Subscription Paid up to 12/2001** یا کوئی اور مہینہ لکھا ہوگا۔ آپ براہ مہربانی اس عبارت کو ہر مہینہ شمارہ ملنے پر پڑھیں۔ اگر آپ کا زرشرکت ختم ہو رہا ہو تو رقم ارسال کردیں تاکہ یاددہانی کی ضرورت پیش نہ آئے۔

(5) اگر آپ شمارہ جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں تو زرشرکت ختم ہونے سے پہلے ادارہ کو مطلع کریں تاکہ شمارہ بند کیا جا سکے۔

(6) اگر آپ اپنا ایڈریس تبدیل کرانا چاہتے ہوں تو ادارہ کو اس کے متعلق ہر ماہ کی 15 تاریخ تک مطلع کریں۔ بصورت دیگر شمارہ پہلے ایڈریس پر ہی روانہ کیا جائے گا۔

(7) مجلّہ طلوع اسلام کے زرشرکت کے لئے منی آرڈر بھیجتے وقت اپنا ایڈریس صاف اور خوشخط لکھیں تاکہ ایڈریس میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ شکریہ

ایاز حسین انصاری

چیئرمین ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سام جیران
ترجمہ:- عبدالغفور محسن

ماسکو سے ایک پیغام

میں نے روسی زبان وادب کا مطالعہ کیا اور پھر وہیں چار پانچ سال تک کام کرتا رہا اسی دوران میں نے قرآن کریم بھی از خود پڑھا۔ یہ سلسلہ کوئی چھ ماہ تک جاری رہا۔ میں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ قرآن اللہ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لئے ایک مکمل پیغام ہے اس ضمن میں میں نے مذہبی پیشوائیت کے مرتب کردہ رطب ویابس سے عموماً اجتناب کیا۔ جب اسلام کے متعلق تحقیق میں مصروف تھا تو میں نے محسوس کیا کہ مسلمان عمومی طور پر قرآن سے جو انسان کو اس کی تخلیق سے مصاف زندگی میں جدوجہد تک' رہنمائی دیتا ہے' دور رہتے ہیں۔ دریں اثناء مجھے بائبل کے بھی مکمل مطالعہ کا موقع ملا۔ لیکن وہاں میں نے سوائے اذہان کو سن کر دینے والے اور خلاف فطرت افسانوں کے اور کچھ نہ پایا۔ تاہم اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں تقابلی مطالعہ کے بعد مسلمانوں (اور عیسائیوں) کے پڑھے لکھے طبقہ سے کھلے انداز میں بات کر سکوں۔ لیکن افسوس کہ میرے اس انداز پر ارتداد کا ٹھپہ لگا دیا گیا اور مجھے ناقابل برداشت مشکلات اور دھمکیوں سے عہدہ برآء ہونا پڑا۔ جس کی وجہ سے میں بڑی حد تک محتاط ہو گیا تاہم اس تلاش میں رہا کہ مجھے کوئی واقف حال مرد کامل مل جائے جو مجھے دولت یقین سے مالا مال کر سکے لیکن ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔ اب میں کسی حد تک مطمئن ہوں کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں انٹرنیٹ کے ذریعے ناقابل رسائی مسلم دانش وروں سے تعلق پیدا کر سکتا ہوں ان میں سے چند کے علاوہ زیادہ تر دانشوروں نے مجھ میں یہی تصور راسخ کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کے تصورات عام سطح زندگی سے نیچے ہیں تاہم میں اپنے ارادوں پر مضبوطی سے قائم رہا اگرچہ اس کوشش میں مسلسل دس سال تک مجھے اپنی ذہنی توانائیاں ضائع کرنا پڑیں۔ اس تمہید سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجھ پر کیا گذری ہو گی۔

روسی قوم بالشویک نظام کے روبکار آنے کے بعد سے اپنے آپ کو شعوری یا لاشعوری طور پر انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتی رہی ہے اور اس دور کی کامیابیوں کے بعد اس نکتہ نظر کو کسی حد تک ثابت بھی کرتی رہی ہے۔ یہ قوم بساط زندگی پر شطرنج کی چالیں چلتی رہی ہے جس میں کامیابیاں اور ناکامیاں بھی ہوتی رہی ہیں لیکن اب جبکہ سوویت یونین کی اپنی بساط الٹ گئی ہے اس میں کچھ نئے انقلاب کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں اور کچھ ایسی جماعتیں معرض وجود میں آ رہی ہیں جو اب اپنے آپ کو رکے ہوئے گندے پانی سے تشبیہ دے رہی ہیں۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا ہے کہ وہ حسابی انداز میں معلوم کریں کہ ان سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں اور متذکرہ بالا شطرنج پر کھیلنے کا صحیح طریقہ کیا ہونا چاہئے تھا اور اب مسائل سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے۔ وہ یہ صرف روس کے متعلق نہیں پوری دنیا کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک بین المملکتی ادبی مجلس قائم کی ہے۔ ان میں بعض انتہا پسند لوگ بھی ہیں تاہم وہ سب حقائق تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں خود ترسی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کر رہے ہیں۔ مختصراً یوں سمجھیں کہ انہوں نے مسائل کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان چھ مسائل کو دو گروپوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ پہلے گروپ کو وہ معلومات کی

طاقت اور اس سے متعلق ذیلی محرکات کو رکھتے ہیں اور دوسرے گروپ میں وہ پہلے گروپ سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں عمل کا ذکر کرتے ہیں۔

Informational Weapon

معلومات کا ہتھیار۔

1- شماریات۔ Methodology

یہ وہ حصہ ہے جس سے فلسفیانہ موشگافیوں اور میڈیا کے ذریعے سے عوام میں کچھ عادات پختہ کی جاتی ہیں۔ یوں سمجھیں کہ اس طرح عوام کے اذہان میں نئی سوچ ابھاری جاتی ہے۔

یہ مخصوص سوچ اس طرح ذہن استعمال کرنے کا باعث بنتی ہے جس طرح ان کے میڈیا والے چاہتے ہیں اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے دنیا کے عوام کے نکتہ نظر کا تمغہ دے دیتے ہیں۔

2- تاریخ۔ History

اس کا تعلق بھی پہلے درجہ سے ہی ہے تاہم یہ اس سے ذرا آگے کی بات ہے۔ تمام تاریخی معلومات کسی خاص نکتہ نظر۔ جسے ہم امکانات پر مبنی کرتے ہیں۔۔۔۔ سے ہی متعلق نہیں ہوتیں۔ یوں سمجھیں کہ (روسی سیاسیات کے حوالے سے) یہ معلومات نام نہاد روسی قراردادوں پر مشتمل ہیں اور یہ کہ ان کے بنانے والے زیادہ تر یہودی ہیں۔ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا نشانہ کون کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ مغربی کتب خانوں میں خاص قسم کی نظریاتی کتب ملیں گی جو تاریخی حقائق بیان کریں گی جن کا زیادہ تر تعلق سویت یونین سے ہوگا۔ نپولین کہتا ہے ''ہماری تاریخ' تاریخ ہی نہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے جس پر مختلف الآراء افراد کی رائے متفق ہو گئی ہے'' دراصل ہمیں یہ اندازہ کرنا ہوگا کہ جو کچھ ہے وہ کیوں ہے اور یہ کہ ہم حقائق معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

3- حقائق۔ Facts

آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذہب' نظریات' اخبارات اور کچھ خاص قسم کے ناول اشاعت پذیر ہوتے ہیں جنہیں بے انتہا شہرت دی جاتی ہے۔ یہ خاصا وسیع موضوع ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ملک سے باہر ہو تو واپسی پر وہ گونا گوں قسم کی کتب دیکھتا ہے جو ایک خاص نکتہ نگاہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ذہنوں کو لکھنے والوں اور لکھانے والوں کے نظریات سے متاثر کرتی ہیں۔ ان میں حقائق کا وجود نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے لیکن انہیں حقائق کا نام دیکر پیش کیا جاتا ہے۔

Material Weapon

مادی ہتھیار

1- معاشیات

سرمایہ دار دنیا کی دولت اور ادھار کا سسٹم فالج کی طرح سودی نظام کے ذریعے انسانی اعصاب پر چھایا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ دوسرے ممالک پر کنٹرول اور بالادستی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ امداد کا لفظ محض ایک افسانہ ہے۔ کسی کو کچھ بھی مفت نہیں دیا جاتا۔ دانشور جانتے ہیں کہ یہ بڑی طاقتوں کا بہت ہی موثر ہتھیار ہے جس سے وہ ترقی پذیر ممالک کو دبائے رکھتے ہیں اور اپنے حق میں بات کرنے پر مجبور کئے رہتے ہیں۔

2- نسلیت۔ Genocide

نسلیت کا ہتھیار ایسا تباہ کن ہے کہ یہ نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آئندہ نسلوں کو بھی متاثر کرتا ہے اس سلسلے میں الکحل۔ ہر قسم کی دوائیوں' برین واشنگ اور نسلیاتی انجینئرنگ' ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ منشیات کی روک تھام کو پالیسی بنایا جاتا ہے لیکن اسی کے ذریعے منشیات پھیلائی جاتی ہیں اور اس کا فائدہ وہ اقوام اٹھاتی ہیں جو منشیات کو کنٹرول کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ امریکہ چھوٹے قسم کے پلوٹونیم کے ہتھیار عراق کے خلاف استعمال کر رہا ہے جو کہ نسلوں کو کرپٹ اور کمزور بنا رہے ہیں۔ یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ آئندہ ایجاد کی جانے والی خوراک بھی یہی کچھ کرے گی۔ اس کا اندازہ آپ کو آئندہ دس سالوں میں ہو جائے گا۔

3- روائتی ہتھیار- Traditional Arms

ایٹم بم، گنز، کرائے کے سپاہی، ٹینک۔ ان تمام ہتھیاروں کے متعلق میڈیا کے ذریعے معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ عام لوگ زیادہ تر ان کے محض چند حصوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا MV کا نظریہ یہ ہے کہ یہ قوتیں خاصا اثر رکھتی ہیں اور مذکورہ بالا کچھ نکات نظر کو بھی متاثر کرتی ہیں۔ ان کا مقابلہ بہت ضروری ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ متاثر ممالک ان نشتروں کے گہرے اثرات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ہماری متذکرہ بالا جماعتوں کے گروپ نے ان تمام نظریات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ مختصر طور پر انہوں نے یہ نتائج حاصل کئے ہیں کہ یہ تمام نظریات بنائے ہی اس لئے گئے ہیں کہ وہ بالا دست اقوام کے حق میں استعمال ہو سکیں۔ عوام کو غریب اور روٹی کپڑا کے حصول میں مصروف رکھا جا سکے۔ وہ جو کمائیں اسے غیر ضروری طور پر ضائع کر دیں۔ تمام مذہبی کتب اور ان سے پیدا ہونے والے نظام اسی لئے وجود میں آئے ہیں کہ اس طرح ان کے پیروکاروں کے اذہان کو کنٹرول میں رکھا جا سکے اس سلسلے میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ ہے قرآن۔ مذکورہ گروپوں نے ایسی تمام چیزوں کو الگ پھینک دیا ہے۔ (اور صرف قرآن کو لیا ہے) میں اس سلسلے میں چند صفحات ترتیب دے رہا ہوں جو آئندہ چھ ماہ میں آپ کے پڑھنے کے قابل ہو سکیں گے۔

تمام مذاہب کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عوام تیسرے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سرمایہ داروں کے نادیدہ ہاتھوں میں رہیں۔ اس میں رائج الوقت اسلام اور اس کو امداد دینے والی روایات بھی شامل ہیں تاہم ہم قرآن کا حد درجہ احترام کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوئی۔ وہ تنبیہہ و تنذیر کرتا ہے، خوش خبری دیتا ہے کہ دنیا موجودہ دور کے آخری کنارے پر پہنچ چکی ہے اور آئندہ صدی کو قرآن کا عہد کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ ریسرچ ہے جو دانشوروں کے اذہان کو متاثر کر رہی ہے۔ حالانکہ مسلمان مادی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں اور ایسا کوئی مرکز بھی نہیں رکھتے جس سے اس نظریئے کو آگے بڑھایا جا سکے جبکہ قرآن ابتدائے آفرینش سے آج تک کے مذکورہ بالا نتائج تک لے آتا ہے۔ اگر آپ روسی زبان پڑھیں اور چاہیں کہ مذکورہ بالا گروپوں تک رسائی حاصل کر سکیں تو یقیناً متاثر ہوں گے۔ آئندہ مستقبل قریب میں ہمارا کوئی خاص پروگرام نہیں ہے تاہم اگر آپ مزید معلومات کرنا چاہیں تو MV کے http:\\www.kobro.com سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

میں نے حتی الوسع واضح کر دیا ہے کہ میں نے مختلف اوقات میں بہت مشکلات کا سامنا کیا ہے لیکن میرا مندرجہ بالا گروپوں کے متعلق خیال ہے کہ ان کی وجہ سے میں محفوظ ہوں۔ خصوصاً ان مذہب زدہ ظالموں سے جن کے پاس سنتوں کی لمبی لمبی فہرستیں تھیں اور جن سے ابتداء میں مجھے تنہا مقابلہ کرنا پڑا اس لئے کہ میں شاید کچھ خاص قسم کا مسلمان تھا۔ اب میں نے اپنے آپ کو قرآنی مسلمان کہنا شروع کر دیا ہے یا مجھے آپ Quranicist یعنی محض ''قرآنی'' کہہ سکتے ہیں۔ میں اسلام کے ہزار سالہ احمقانہ اور رطب و یابس سے بھرپور مذہب سے بیزار ہوں جس کے متعلق بات کرتے ہوئے سخت شرمندگی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے بس قرآن کافی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عطیہ

بزم طلوع اسلام ٹورنٹو، کینیڈا — 50,000 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد سلیم اختر

روداد بسلسلہ تقریب 23 مارچ 2001

۲۳ مارچ کا تعلق ادارہ طلوع اسلام سے دوگونہ ہے۔ ایک تو ''یوم پاکستان'' کے حوالے سے دوسرے اس روز یعنی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک میں منعقد ہونے والے تاریخی اجلاس میں' جو کہ آگے چل کر قیام پاکستان پر منتج ہوا' ادارہ طلوع سلام نے بھی اپنے پمفلٹس کا اسٹال نصب کیا تھا۔ اس دوگونہ تعلق کی بنا پر ادارہ طلوع اسلام نے ۲۳ مارچ ۱۹۹۹ء کی طرح امسال بھی یوم پاکستان کے موقع پر مینار پاکستان کے زیر سایہ اپنی کتب اور پمفلٹس کا اسٹال لگایا۔ پہلے کی طرح بادشاہی مسجد کے سامنے' آزادی پارک کے گیٹ کے ساتھ قناتیں اور شامیانے نصب کر دیے گئے' جن پر طلوع اسلام کے' قرآنی آیات سے مزین بڑے چھوٹے دل کش بینر آویزاں کئے گئے تھے۔ ایک جانب ادارہ طلوع اسلام نے اپنے درجنوں پمفلٹ اور شمارہ جات اور دوسری جانب طلوع اسلام ٹرسٹ نے اپنی شائع کردہ کتب میزوں پر حسن کارانہ سلیقے سے سجا رکھی تھیں' درمیان میں مہمانان گرامی کے لئے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں اور کرسیوں کے سامنے بڑی سکرین والے رنگین ٹی۔وی پر مفکر قرآن علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی گل افشانی گفتار موج اوج پر تھی۔ بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندگان محترم ماسٹر احمد علی صاحب (اوکاڑہ)' اسلم نوید صاحب (بوریوالہ)' محمد اقبال صاحب (کراچی)' آفتاب عروج صاحب (چنیوٹ)' چوہدری نثار احمد صاحب (راولپنڈی)' اشرف ظفر صاحب (لاہور) اور محمد افضل صاحب چک 215/EB سے ادارہ کے ساتھ یوم پاکستان منانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ پشاور بزم کے ارکان ڈاکٹر سعید شاہ صاحب' فرحان صاحب' معراج نبی صاحب اور عبداللہ ثانی صاحب کے علاوہ بزم سوات کے ارکان' خورشید انور صاحب اور منذزئے خان صاحب نے ادارہ کے کارکنان کے ساتھ' بینر لگانے' کرسیاں بچھانے اور دیگر انتظامات میں ہاتھ بٹایا جبکہ پمفلٹس کے اسٹال پر بھی خورشید انور صاحب' فرحان صاحب ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے۔

امسال ۲۳ مارچ کو ملک کی سیاسی جماعتوں نے جلسے جلوسوں کا اعلان کر رکھا تھا اور حکومت نے ان کو سختی سے روکنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ بنابریں جگہ جگہ ناکہ بندی اور رکاوٹوں کی وجہ سے لوگوں کی زیادہ تعداد آزادی پارک نہیں آسکی۔ تاہم اس کے باوجود مینار پاکستان کے گرد اچھی خاصی رونق رہی اور لوگ طلوع اسلام کے اسٹالز پر بھی آتے رہے۔ حسب سابق بزم طلوع اسلام لاہور نے پینے کے پانی کی سبیل لگا رکھی تھی جس سے لوگ اپنی پیاس بجھاتے رہے اور پمفلٹس بھی خریدتے رہے' کچھ کرسیوں پر بیٹھ کر پرویز صاحب کی تقریر سننے میں محو ہو جاتے اور کچھ کتب کی ورق گردانی میں مصروف۔

طلوع اسلام ٹرسٹ نے ایک بورڈ پر اسلامی معاشرت مفت حاصل کرنے کے لئے پتہ درج کرنے کی درخواست تحریر کر رکھی تھی' جس پر لوگ اپنے پتے درج کرتے رہے۔ اس طرح یہ سلسلہ رات آٹھ بجے تک جاری و ساری رہا۔ سینکڑوں پمفلٹ لوگوں نے خریدے اور سینکڑوں مفت تقسیم کئے گئے۔ بلاشبہ اس موقعہ پر بہت سے نئے لوگ طلوع اسلام کے نام اور پیغام سے متعارف ہوئے۔

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

عطیات برائے کراچی بزم آفس بلڈنگ پراجیکٹ

نمبر شمار	معطیات	رقم	
-1	محترم افتخار وخالد	50,000	روپے
-2	بزم طلوع اسلام کویت	2,50,000	روپے
-3	طلوع اسلام کے ایک خیر خواہ جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔	2,50,000	روپے
-4	محترم طارق عزیز' انگلینڈ	1,000	روپے
-5	محترم محمد طارق' لاہور	2,000	روپے
-6	محترم محمد حسین	500	روپے
-7	محترم عبدالرؤف	500	روپے
-8	محترم ڈاکٹر اسلم نوید' بوریوالہ	3000	روپے
-9	بزم طلوع اسلام پارک ایونیو' کراچی	5000	روپے

کنونشن 2000 فنڈ

نمبر شمار	معطیات	رقم	
-1	بزم طلوع اسلام ڈنمارک	10,000	روپے
-2	بزم طلوع اسلام کوئٹہ	7,000	روپے
-3	محترم ڈاکٹر شبیر احمد' فلوریڈا' امریکہ	5,975	روپے
-4	بزم طلوع اسلام کویت	40,391	روپے

سانحہ ہائے ارتحال

بزم طلوع اسلام حیدر آباد کے سرگرم رکن محترم پروفیسر محمد ہاشم جوکھیو کے بھائی طویل علالت کے بعد وفات پا گئے ہیں۔ دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب ہو۔ ادارہ مرحوم کے بھائی محمد ہاشم جوکھیو صاحب اور ان کے دیگر اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بزم طلوع اسلام سوات کے فعال رکن محترم عبدالرشید صاحب کی اہلیہ محترمہ ۱۰ مارچ کو وفات پا گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ ادارہ عبدالرشید صاحب اور مرحومہ کے دیگر لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

کامل مومن وہ ہے جو خوش اخلاق اور گھر والوں سے نرم سلوک کرنے والا ہو۔ (ترمذی)

A perfect believer is that who is nice in behaviour and kind to his family members. (Tirmizi)

SHAHAB

QUALITY PISTON RINGS

THE ONLY MANUFACTURERS OF INTERNATIONAL QUALITY PISTON RINGS IN PAKISTAN.

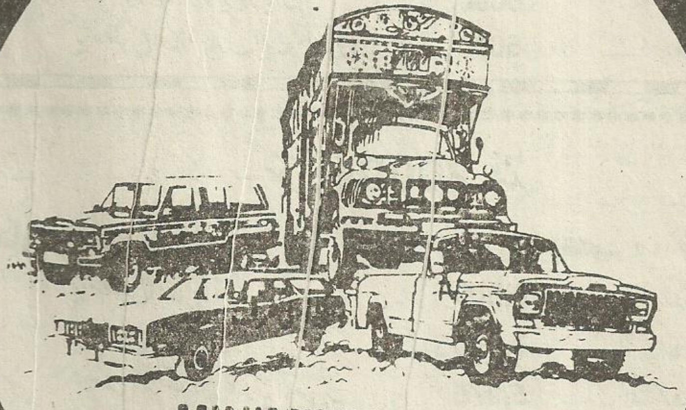

MINIMIZE WEAR
RESTORE COMPRESSION
GET MORE POWER
CONTROL OIL

CALL US FOR THE EXCELLENT RECONDITIONING OF AUTOMOBILE ENGINES OF ALL KINDS.

M. SHAH MOHAMMAD & SONS (PVT.) LTD.
OUTSIDE PAK GATE, MULTAN, PAKISTAN
PHONE OFFICES : 545071, 43671, 539071-73
FACTORY 550171

Quranic Lectures (Dars-e-Quran in Urdu) In Foreign Countries.

	Place	Day	Time
Canada	627 The West Mall, Suite 1505 Etobicoke—Ontario E-mail: bazmtoronto@hotmail.com	First Sunday of the Month	11AM
Denmark	M.Afzal Khilji Gammel Kongevej 47, 3 th 1610 Kobenhavn v Ph:Zafar Khan:(45)35 38 2595 Or (45) 35 81 4545 E-mail: ZKhan@get2net.dk	Last Saturday of the month	7PM
England Ilford	76 Park Rd, Illford, Essex IGI 1SF Ph & Fax:020 8553 1896, E-mail: Bazm.London@virgin.net	First Sunday of the month	2.30PM
Crawley	53 Downland Drive, South Gate West, CRAWLEY West Sussex RH1 8QZ Ph: M.Khalil: 01293-446258 Or Arshad Mahmood: 01293-419784	Last Sunday of the month	2 PM
Hounslow	86 Meadowbank Gdns, Cranford Middx, TW5 9TU Ph:Tariq Aziz:020 8283 9957 Mobile: 07939 - 017117, E-mail: babajee@btinternet.com	Every 3rd Sunday of the month	14.30PM
(LADIES ONLY) Clayhall	72 Herent Drive, Clayhall Illford, Essex, IG5 0HG Ph:Rubina Khawaja:020 8550 3893 Mobile: 07931351559 Suriaya Farhat:020 8553 1896, E-mail: rafiquefoundation@tinyworld.co.uk	Last Friday of the month	12.30PM
Manches-ter	33 St. Georges Rd, Fallowfield, Manchester, M14 6SX Ph:A.Rashid Qureshi:0161-976-3150 Or Mahfooz Ahmad:0161-286-5496 E-mail: rashid_q95@hotmail.com	Every Friday	7PM
Norway	Lindebergaasen 15B, Oslo Ph:Khadim Hussain Malik: (47)22-61-0448, E-mail: khadim@online.no	First Sunday of the month	3PM
USA 1. Ohio Bazm	Islamic Center of Greater Toledo Perrysburg, Ohio. Contact:Sister Amina Ahmed Sub-Contact:Dr. Mansoor Alam Phone :419-530-8161, Fax:419-530-8146 Email: malam55@hotmail.com	Every Sunday	10:30 am 12:30
2. N.Y Bazm	Bazm Coordinator: Sister Tehmina Mian Sub - Contact: Dr. Hamid Mian Phone: 914-226-2254, Fax: 914-226-2251 E-mail: tmian60022@aol.com		

All publications & Literature published by
Idara Tolu-e-Islam (Regd.) Lahore, Tolu-e-Islam Trust (Regd.) Lahore
are also available from above overseas addresses

country, and the masses were not yet ready for it. As time passed, the course of events proved he was right. Ever since there have been individuals who are inspired to establish ''nizam-e-Rububiyat'' (nourishment and development of the people) at the behest of the Tolu-e-Islam, or bring about changes in the institutions and rituals which only the government at the central capital is empowered to do or can do it. Actually the Message is so powerful, and inspiring and inevitable that one is ready to take any risk and commit the ultimate and die for the cause. But there is a catch here as well. I recall that sometime in the sixties in a country in the Far-East or South-East Asia—I forget which one it was--an individual followed by others surrendered their lives in the blaze of world-wide public gaze. It triggered of a revolution of tremendous magnitude. With a shine in his eyes, Parwez Sahib remarked that wonders can be achieved when the people at large are ready for it. But he added, in a contrary situation, when the time is not yet ripe, the budding revolution can be totally crushed with devastating effect by such individual sacrifices.

I shivered at the thought of it!

(Shamim Anwar)

****

Dr. Sayed Abdul Wadud Explains Surah Ar-Rehman Scientifically

Dr. Sayed Abdul Wadud has produced a pamphlet in English in which he has given the scientific explanation of the first 27 verses of Sura Ar-Rehman (55).

The 'Tafaseer' produced by our renouned exegists do not explain the scientific aspect of the verses because they are not acquainted with it. With the advance of time, this aspect of Quranic verses is coming into light. The more our knowledge of the universe increases, the more we come to understand the Quran.

However, there are limitations as far as the knowledge of the Quran is concerned as well as of science. As a matter of fact, it is not possible for any human being to know all or even the substantial part of the natural phenomena around us. The Quran says: "If all the trees of the earth were pens and a oceans were ink with seven oceans behind it to add to it's supply, yet would not the infinite signs of Allah be exhausted. For Allah is exalted in power and full of wisdom. (31:37).

Dr. Sayed Abdul Wadud

THE TIME FACTOR

It is a natural desire among humans to measure things and events in time, in keeping with their own life span. One desires to witness the results of ones efforts before ones own eyes. There is nothing wrong with that, but Nature has its own course to follow, its own universal process of cause and effect and its own timings. Of course the implication is not towards its arbitrariness and waywardness. On the contrary, these laws governing human life are as exact and precise as the laws governing the universal world of matter. Human effort should be to work in harmony with them and with maximum possible effort.

While ruminating over this I was reminded of what Parwez Sahib said during one of my almost daily visits after 4 p.m., when he welcomed all and sundry while strolling in his lawn, or in his multipurpose study room, depending on the weather. Parwez Sahib reminisced that Qaid-e-Azam, during the last days of the Indian freedom movement, asked him whether Pakistan would be achieved during his life-time. He replied that when a similar wish and query occured in Muhammad's (PBUH) mind, the Quranic reply was that his mission was to continue working to his maximum capacity, the results would occur according to the universal laws governing human life. Hearing this, Qaid-e-Azam became tearful. On anxious enquiry, he replied that if this was said to Muhammad (PBUH) then he was nowhere to be counted.

In this background must all movements be evaluated, be they struggle for freedom and independence, or struggle for reconstruction of the system and institutions. Life is constant tension and struggle and it is the supreme, objective law of evolution and change that we must all imbibe individually and collectively. Non-recognition of it can lead to all kinds of misunderstandings and ultimately to chaos and failure. The people to benefit from it would be no other than the enemy within and the enemy without.

The initial contact with the Revolution that is the Quran, one gets extremely excited. I did too, especially when the masses were galvanised by Bhutto, arguing with Parwez Sahib that we should have done the same; and accordingly even wrote a letter to the editor of a daily newspaper. However, Parwez Sahib calmly explained that primarily his mission was an appeal to the intellectuals and the youth of the

(hoarding) of every conceivable commodity in the world and even destroying crops and food to maintain high prices by the wealthy nations, when the majority of the world lacks even the basic necessities of life such as clean water, food and medicine is inhuman, for this action is the first step in the denial of equitable distribution of resources for human survival and the final act towards the stratification of humanity into the first and the third world.

Couple of years after Tanzania's independence, a famous English language magazine, published a cover feature and commented upon the country's socialistic policies, development efforts and economic strategy and advised that the country should lift itself by the 'boot straps'. The then President Nyerere wisely reminded the writer that Tanzanians *do not have boots!*

In spite of this and after all is said and done about the rich Western nations doing next to nothing for the poor world, except giving aid with lots of strings attached (white elephants) or charity with lots of fanfare when disaster strikes, they, the so called *kafirs* at least look after their citizens, unlike our so called Muslim countries. Credit should be given where credit is due for the West has established the systems of maintaining a datum for life sustenance and therefore some of its dignity! Is it any wonder that most of the third world likes to flock to the first world with whatever means, often with tragic consequences? However our 'rich' move quite safely from their palaces to other palaces (even royal ones) with impunity.

Charity is the offering of ones wealth, over and above ones needs (after tax) to help the needy in emergency. Nowhere in the history of mankind has there been an example of such a revolution in the community as in Madina during the very early stages of Muhammad's migration there. The sharing of material wealth by the *Ansaars* with the *Muhajirs* would be called today as a paradigm shift in social attitude. (13/11) It was this shift that stabilised the traumatised society and was the trigger for the embryonic establishment of the City State, which later became a great Muslim Empire.

Unlike in other religions *(Islam is not a religion but a code of life)* which tolerate and even concede poverty as a virtue (the poor are the children of God) so that others can gain pious merit by handing out charity to them. This is not tolerated and poverty would not exist in a State run on Islamic principles of "establish *Salaah* and proffer *Zaqaat*". When we look around us, we do not find a single state in the Muslim world (many of them extremely rich), which does justice to the name Muslim state.

****

equitable distribution to its citizens for their welfare and development according to the needs. Unlike in the other philosophies an Islamic government is not a separate entity from the rest of the civil society. *In Islam the rulers are the role model for the society to follow.*

The resource necessary to fulfil the requirements is dependent upon the wealth of the nation and the capacity of its citizens to proffer the *zaqaat* (income tax). No where in Quran does it fixes *Zaqaat* to any prescriptive figure let alone just 2.5% of ones income. But for the State to fulfil its obligations, the citizens must, as a duty, fulfil their obligations (5/1) to the State in order to establish the system of *salaah* (4/15) for the welfare of its entire community.

The First Khalif, Abdullah Abu-Bakr Siddique spent most of his two years in office campaigning against the rebels, who refused to contribute *zaqaat* to the state revenue. His campaigns were to collect State Tax for the running of the State affairs, not charity. Nor can any fair-minded person allege that he collected the revenue to enrich himself, which is the norm with most of our rulers. History in fact tells us that indeed the opposite was the case for the Khalifa gave all his wealth to the State.

This action on the part of the State establishes the precedent that *Zaqaat* is a State Tax and the government has the right to collect it even by force, so that the State can provide for all the legitimate and basic necessities of the society and ensure that the dignity of its citizens is maintained in order that they can progress and develop their potential at their own pace. Equally it is obligatory upon the citizenry to fulfil its duties for the benefit of all in the community and thus contribute in establishing the systems of justice and fairness (22/41). Conversely to demand State help, where it is legitimate and deserving, is a right of the citizens. However if the State (those in authority) are unjust and the citizens fraudulent, they commit a crime against mankind!

Some years back it was claimed by the economists that only a couple of the top rich Muslim States could have provided for the whole of the Muslim world's budget. But of course, that must have been prior to their mutual wars! One may safely assume now that all their surplus and reserve of wealth had been equitably distributed among their first world masters, who got paid in the first instant for destroying and then for the repairs of the havoc and damage of the wars. And what of their current income? Spent on erecting gaudy monuments and towers (Alburooj) to the glory of the rulers and their personal wealth. Alas! Designed, built and operated by their foreign masters!!

The principle of equitable distribution of wealth is not limited only to the economics of a particular State but the whole world. Amassing 'Strategic Reserve'

SOCIAL JUSTICE IN ISLAM

By

A.Rashid Samnakay

****

The essentials of equitable distribution of wealth and the elements of social justice is lost among us who profess to adhere to Quranic values, including the Muslim majority countries and even professedly Islamic States! The simple reason being that the Quranic ordinance of dutifully proffering (as opposed to grudgingly paying) state dues and the fair distribution of that revenue by the State are nonexistent in our countries. That is because the establishment of social justice *(Salaah)* and distribution of wealth *Zaqaat* is interpreted as the five 'canonical Prayers' and 'Regular charity' or poor-due respectively.

The word charity has the connotation of extra meritorious and self gratifying act, performed on others at the expense of their dignity and the assumption that they are disadvantaged and some what socially inferior. It also conjures up the impression that there are and will always be disadvantaged people in the world as a law of nature, so that charity can be practiced upon them to earn merit! It could be argued that the latter also consider themselves meritorious too as they are providing the means for the former to gain merit!!

With the above logic, would it then not become essential for Muslims to ensure the existence of the poor class so that the group with advantages (the haves) can fulfil its obligations to their religion? This thought process is responsible for the caste system with religious twist to it!

Needless to say that the above is diametrically opposite to Quranic teachings, which endeavours to ensure the equality and to uphold the dignity of all mankind (17/70). As Quran is the synthesis of all divine messages brought by the messengers of God (37/37, 41/43), their emphasis has always been on equitable distribution of wealth in order to eliminate the stratifications, (except those based on *amaal*- deeds).

Poverty is a disadvantage and absence of resources to fulfil the essential requirements of life. On individual basis the requirements of mankind as a whole cannot be fulfilled. They can only be fulfilled by the State and in essence that is its 'obligation'. It has to establish the system of justice such as the fair proportion of tax imposition, its collection, its management, administration and legislation for this

In our *hadith* collection we also have a portion that is concerned with the character traits of the Messenger. The character of His Holiness Messenger Muhammad[PBUH] is a paragon of humanity. Unfortunately, we also have some, among our *Ahadith,* that blemish and stain his character. For this purpose it is advised, the biography of His Holiness Messenger Muhammad[PBUH] ought to be rewritten in the light of the Quran, concentrating on his character alone. Only those essentials be borrowed from the *Hadith* books that correspond with the teachings of the Quran. Those traditions that do not tally with the Holy Quran or those that fantasize the Messenger's character must be discarded.

This is the correct scenario of Hadith. Unless and until we are not prepared to give our treasure of Hadith its proper place, we shall not be able to find our way out of this imbroglio or solve the enigmas in which the Muslim ummah is surrounded and going hay-wire for the past several centuries. We also hope that you will give your serious thoughts to these matters of Hadith with a cool mind. Then only shall we abate this ancient chronic aberration.

(To be continued)

****

MATRIMONIAL

A highly successful Quranised business executive, MBA, 32; ambitious, aggressive, is now looking for a life partner. The girl should be doctor (MBBS/BDS) around 28 years old. She should be equally ambitious and aggressive. She would get a superb environment and ultimate encouragement for higher studies (e.g; Part 1&2) and for personal and professional growth. This is a unique opportunity to love, to live, to laugh, to learn and to leave others behind. The parents, in first phase, should send only the particulars of the girl stating her strengths, her educational details, personal vision and values and a latest colour photograph (if possible). The family details would be requested later. Rest assured that all correspondence would remain highly confidential. No caste, no province, no linguistic barriers. Please contact: C/o Editor Tolu-e-Islam or Email: RAJL_e_rasheed@hotmail.com

"The real character that shines of the Messenger and his disciples, which we must follow, is that they controlled the physical laws by Islamic laws and thereby fulfilled their sacred duty. They imbued a fresh spirit in the culture of their times. Thus, the real followers of the Messenger and his disciples are those who try to enslave the resources of the discoveries caused by physical laws and cultural evolution and bring them under Islamic culture, as was done by the pioneers of Islam." (Nishan e Rah page 55)

Maulana Ameen A. Islahi is of the opinion, that not only Quran, the *Hadith* also mostly contains principles, and their corollaries are left upto the *Muslim Ummah* to decide for themselves. He says:

"In the Quran and Hadith we find only the basics. Both the books have avoided the details and explanations. To replenish this void, they leave it for the Ummah, according to their standards to make Islamic laws, for their collective and political matters." (Tarjuman ul Quran, April 1954)

We also mentioned, wherever the Quran speaks 'to follow Allah and Messenger' it means a system which has been established to implement God's laws. Let us see what Maulana Maudoodi has to say about this. In sura, Al-Ma'aida's *ayat* 33 it is said:

And those of you who fight against Allah and His Messenger are given the punishment of.................

Endorsing the above *ayat* Maulana Maudoodi writes in Tafheemul Quran:

"To fight against Allah and His Messenger means waging war against the leading system which the Islamic government has established." (Tafheemul Quran, vol. I, page 465)

Thus 'to follow Allah and Messenger' does not mean to follow the 'Quran and the *Hadith*' according to our own personal standards. It is abiding by the laws of God imposed by the central authority. It is the duty of the central authority to carry out and implement these laws of God. This is the actual meaning of 'to follow Allah and the Messenger.' Insubordination to these laws is not only immanent, the person is practically involved in a crime of treason. Without this central authority 'to follow Allah and Messenger' means worshipping individually, in which a coterie or a single person enacts according to his/her own standards. After the establishment of an Islamic system, to follow 'Allah and the Messenger' have an altogether different meanings i.e., to abide by the decisions of the central authority. This is the purpose of Deen and by means of this we gain solidarity.

whole then, the attitude of Abu Hanifa towards the traditions of a purely legal import is to my mind perfectly sound; and if modern Liberalism considers it safer not to make any indiscriminate use of them as a source of law, it will be only following one of the greatest exponents of Mohammadan Law in Sunni Islam." (Pages 171-173)

Of the changing environment during the days of the Messenger, Maulana Maudoodi says:

"It is an undeniable fact that the Lawmaker after administering the highest degree of wisdom and the finest knowledge, has suggested those principal laws that are applicable and fulfill the needs of all times and all conditions. Inspite of all this, majority of sub-clauses in the details of principal laws need amendments because of the changing environment. The conditions that prevailed during the times of the Messenger in Arabia, cannot necessarily prevail in the rest of the world and through different ages. It would be traditional or conventional to give a permanent status to those sub-clauses of Islamic laws that fulfilled the requirements of those times and that has nothing to do with Islamic spirit...... It is known a person must; in every matter keep a keen eye on the aims and objectives of the Lawmaker, so that the changes in the details may correspond with the basic principles." (Tufheemaat, vol II, page 327)

At another place he speaks on the same issue that:

"When we speak of gaining similarity with Medina, we do not by any means want to be similar in the outward appearance. We do not want to regress, from where the world stands today, into those times of thirteen centuries before. This is a completely wrong notion of 'following the Messenger' principle, but mostly the religious community takes the same meaning. According to them, to follow in the footsteps of the forefathers of disciples means to keep a fossilized version of their culture till the end of times. whatever is happening outside our culture and the changes that are taking place must not be cared for. To construct a wall around our own lives, whereby the movement of time and changing of the times are not allowed to enter. This concept of survival that has been instilled in the minds by religious Muslims belongs to a decadent age and negates the spirit of Islam. Islam does not teach us to become an exhibit of our ancestral past and make a drama of our lives, of the past. It does not teach us a monastic way of living. Islam does not want to produce a nation that tries to impede the progressive stages of live. On the contrary, it wants to produce a nation that ceases the progressive process from taking wrong directions and wants to guide in the correct direction. It does not give us a heart, it gives us the spirit. It desires, that the hearts produced from the changing environment, must be filled till doomsday with this spirit.

tend to immobilize what is essentially mobile in its nature. The failure of Europe in political and social science illustrates the former principle, the immobility of Islam during the last 500 years illustrates the latter. What then is the principle of movement in the structure of Islam? This is known as 'Ijtehad'." (Page 147)

Concerning his views on *Hadith* he says in the same book:

"For our present purpose, however, we must distinguish traditions of a purely legal import from those which are of a non-legal character. With regard to the former, there arises a very imnortant question as to how far they embody the pre-Islamic usages of Arabia which were in some cases left intact, and in others modified by the Prophet. It is difficult to make this discovery, for our early writers do not always refer to pre-Islamic usages. Nor is it possible to discover that the usages, left intact by express or tacit approval of the Prophet, were intended to be universal in their application. Shah Wali Ullah has a very illuminating discussion on the point. I reproduce here the substance of his view. The Prophet method of teaching, according to Shah Wali Ullah is that, generally speaking, the law revealed by a Prophet takes special notice of the habits, ways and peculiarities of the people to whom he is specifically sent. The Prophet who aims at all-embracing principles, however, can neither reveal different principles for different peoples, nor leaves them to work out their own rules of conduct. His method is to train one particular people, and to use them as a nucleus for the building up of a universal Shari'at. In doing so he accentuates the principles underlying the social life of all mankind, and applies them to concrete cases in the light of the specific habits of the people immediately before him. The Shari'at values (Ahkam) resulting from this application (e.g. rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and since their observance is not an end in itself they cannot be strictly enforced in the case of future generations. It was perhaps in view of this that Abu Hanifa, who had a keen insight into the universal character of Islam, made practically no use of these traditions. The fact that he introduced the principles of 'Istihsan' i.e., juristic preference, which necessitates a careful study of actual conditions in legal thinking, throws further light on the motives which determined his attitude towards this source of Mohammadan Law. It is said that Abu Hanifa made no use of traditions because there were no regular collections in his day. In the first place, it is not true to say that there were no collections in his day, as the collections of Abdul Malik and Zuhri were made not less than thirty years before the death of Abu Hanifa. But even if we suppose that these collections never reached him, or that they did not contain traditions of a legal import, Abu Hanifa like Malik and Ahmad Ibn e Hambal after him, could have easily made his own collection if he had deemed such a thing necessary. On the

towards the *Ahadith*. In all this time, that is the main reason why the *ahadith* have remained the centre of Islamic learnings. When the exhausted *ahadith* could not fulfill the needs of the changed environment, authors and priests began to fabricate new ones. New sects came into being, that brought their own self-made *ahadith* to the surface. When centuries passed, these idiosyncrasies acquired the form of a belief that to follow the Messenger, one must follow the *hadith* and those who renounce the *ahadith* are nonbelievers and heretics.

SOLUTION

This is the blatant notion that is the root cause of all problems in matters of Deen. There is one and only one remedy to deal with this monster of a problem and that would be to re-establish once again the Caliphate of God's system. It means, that government of the Muslims and by the Muslims must decide that it shall be governing by the laws and principles in the Quran. The government must impose Quran's Laws and also examine what Quran says about other departments of life and how can Quran fulfill those legal needs. The government must also take advantage from the *hadith* treasure that has come to us through the ages, find in them those laws that synchronize with Quran's teachings and fulfill our requirements also, thus making them a part of the constitution. If and when the government does not find any laws in the *hadith*, in that case in the light of the principles of Quran, the government must make new laws. The basic Shari'at laws of Quran shall remain permanent in the constitution of the government. Those by-laws, whether they have already been formulated or newly made, in the light of the principles of Quran, can be amended according to the changing needs. These laws shall be imposed or enacted, without any discrimination of any faction or sect, on all Muslims equally. This is how the state will begin to create solidarity in the Islamic world. Over a period of time and gradually we should be able to emboss an environment similar to that, which existed during the days of his Great Holiness Messenger Muhammad[PBUH].

To summarize on what we have just mentioned, that the basic laws of Quran will be perpetually permanent. The procedures to execute these laws and making of its sub-clauses according to the changing circumstances of the times, shall remain open to amendment. It shall be of benefit to consider, what Dr. Allama Iqbal had to say concerning this, in his famous work entitled, 'Reconstruction of Religious Thought in Islam.' He writes:

> "...............*The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society based on such a conception of Reality must reconcile, in its life, the categories of permanence and change. It must possess eternal principles to regulate its collective life; for the eternal gives us a foothold in the world of perpetual change. But eternal principles when they are understood to exclude all possibilities of change which, according to the Quran, is one of the greatest 'signs' of God,*

of the Messenger), only those sub-laws were modified that were no more applicable to the changed conditions, otherwise the remaining clauses were left intact, as they were. If the need was felt, new clause was added to the Shari'at law. History of those times does reveal, that new clauses were added later on and those that were amended, in the details of Messenger's legislature.

From the above queries, we must be able to comprehend why the Quran did not give us the details of clauses and sub-clauses of its basic principles or Shari'at laws. And also this should answer our question, as to why the Messenger did not give us in concrete shape, the corollaries of the laws of Allah, that he had imposed in his system of government. The statements and principal laws of Quran were meant to remain permanent and absolute for all times. That is why those laws were preserved forever. In the light of these laws, whatever clauses were approved by the assembly of those times were not preserved, as it was not necessary. The disciples of the Messenger were very much conscious of this too, that is why they also did not feel the need to preserve the *hadith*. On the contrary, they strictly prohibited anyone from doing so also. If the *ahadith* had been preserved, it is quite possible that in later ages these *ahadith*, like the Quran would have been thought permanent and unchangeable.

As long as God's system of Caliphate survived, this reality prevailed and shone through. The 'following of Allah and the Messenger' was very much existing without the *hadith*. Unfortunately, after sometime this system could not continue as Caliphate changed into monarchy. The infrastructure of Deen disintegrated, the dual standards of church and state entered in its system. The dictators took the political affairs in their own hands, while the religious matters (belief, worship or marriage and divorce type of personal laws) were given to the priestcrafts. The concept 'to follow Allah and the Messenger' also changed with the passage of time. As the government did not deem it necessary to analyze or examine the laws of Allah, so the public did not feel the need to follow any human or group of human beings. (*Perhaps Allah gave us this law of being subservient only to Him, because it is the natural need of a human being to feel free. Or, as the times have proved that no human is capable of governing another human being satisfactorily*)

THEN WHAT HAPPENED

The same question was put in those days, as to how can 'the following of Allah and the Messenger' be instantiated. There was no way out, but to assume that to follow the Quran means following Allah and by obeying the statements of the Messenger we would be following Him. And so the need for *hadith* was created. *Since those days we have yet to see another Caliphate of God's system. Because of it we are unable to understand the real meanings and procedures of 'following Allah and the Messenger'*. Since Quran possessed only a few basic Shari'at laws and life matters demanded more elaboration, these elaborate details were supposed to be provided by that Caliphate. Since we are devoid of it now, the eyes keep looking

terminology, 'to follow Allah and Messenger' does not mean to follow ones wishful thinking of our own make-belief world. It meant to follow the system that the Messenger had established. God's commands were present in the Quran. the Messenger with powers bestowed upon him by Allah, according to the needs and ethos of that culture, made the public abide by those laws.

DETAILS OF PRINCIPLES

The second emphatic reality that we observe is that Quran is in possession of some laws. In most matters we find that it provides us with only the basic Shari'at laws (*Ahkam*). The duty of that Islamic Republic was to legislate the clauses and sub-clauses of Quran's basic Shari'at laws or principles, according to the social, cultural and geo-political conditions of the times, by democratic means (in consultation with other Muslims). It is precisely because of this, the Messenger was commanded to consult his disciples and followers. That is how the Messenger was able to legislate the clauses of the basic Shari'at laws or principles given in the Quran. For example, the command of Zakat is given numerous times in the Quran. Inspite of it, we cannot find a single instance, where the amount has been fixed or any detail of Zakat command frozen by any given amount. It means, Zakat was a basic Shari'at law, to provide growth to the Islamic System and consequently to the civilians to nurture their personalities. What will be the infrastructure, how much will be the amount of Zakat collected from each capable person, or what is going to be the mode of expenditure of this revenue, all these details were supposed to be formulated by the Islamic Republic. When the Messenger promulgated the Zakat ordinance, he must have fixed two and a half percent for its amount. It is quite possible in those days, that with this small amount the government was able to cater to its needs. Now from this, we must refrain from jumping to the conclusion that we have fulfilled our responsibility of Quran's command 'to follow Allah and the Messenger.' That by giving Zakat we served Allah and by giving two and a half percent we fulfilled our duty and followed the Messenger's command. The Quran's command 'to follow Allah and His Messenger' was fulfilled in those days, by giving two and a half percent of Zakat to that Islamic system.

THE GROWTH OF THE SYSTEM

The Islamic republic was not established to cease, as soon as the Messenger departed from this world – It was established to remain till the end of times. However this system, after the demise of the Messenger, continued in the shape of Caliphate. Now to 'follow Allah and the Messenger' meant to follow the commands of Allah through the system, whose top official was the Caliph of Messenger. In those days the same measures were taken, to implement and impose the Shari'at laws of God as in the days of the Messenger. As these laws or commands were permanent and unchangeable, no human had the right to make any amendments or modify these laws. As far as the sub-clauses were concerned (that were legislated during the days

III. It is therefore indispensible to believe the words or deeds of Messenger written in *Hadith* books as true and authentic, inspite of the facts that state the contrary. It is insisted that without *hadith* it would not be possible to fulfill the duty of following the Messenger. It is thus compulsory to believe in *ahadith*. The kink of this argument is very glaring.

Allow me to tackle the real question. Actually the root of all problems is *hadith*; rather we must say, in the spirit of Islam, the Quran's command 'to follow Allah and the Messenger,' has been completely misunderstood. The common meanings that are extracted or the interpretations are usually put forth, that we are supposed to 'follow Allah and His Messenger' separately. Also that Allah is followed from the Quran, while the Messenger can be chased by means of the *ahadith*. *(Then the way for us becomes clear to the Heavens! Easy isn't it?)* From the start we have to say, the basic understanding we have, to 'follow Allah and Messenger' separately, is incorrect. The intrinsic point of departure of Quran's system is, that we must only serve God. Worshipping or following any other Entity or Being is totally out of question.

If on the other hand, *Hadith* was the only source by which we could follow the Messenger, then it was the emergent and primary need of Islam, just like the Quran, to preserve the *Hadith* with God's warranty, so that each one of us would have been able to follow the life of Messenger in all certainty. The 'following of God' does not by any way mean, that we may follow our own wishful thinking of God To follow God means to follow His law revealed in the Book. The preservation of which HE took upon His Ownself. By virtue of this, the Messenger became capable of delivering it in concrete book form to the whole of Muslim *ummah*.

In the same vein, *'to follow the Messenger'* will not mean that a person or group makes his own cliches of Messenger's teachings and starts to follow them. It is absolutely necessary, that in order to follow, we must have an objective standard. By this we can conclude, God did not put any seal of His authority nor did the Messenger deliver it to his disciples in any concrete form with his approval; that it was neither in God's programme nor the aim of the Messenger, to preserve the *hadith*.

We again come to the same question, that if *Hadith* is not the source, then what else are we suppose to believe to follow the Messenger's life?

ISLAM IS A COLLECTIVE SYSTEM

The reality is that Islam is not (as is commonly believed) a religion, in which each one of us can worship the God of our own wishful concepts. Islam is a collective system for life, in which we are collectively subservient to the Law of Quran. Islamic republic or system...... is responsible for legislating and imposing God's Laws and having them implemented in the nation. The first Islamic nation was established by

When the clergy demanded to include in the Pakistan constitution a clause, whereby no law shall be passed that is against the '*Book and Sunnah.*', we wrote, it will not be possible according to this condition, for all the diverse factions, to unanimously declare any amendment in its constitution to be Islamic. For this statement of ours the reason we provided was, that 'Quran' no doubt is the highest common factor among the various Islamic sects (in this we did not argue on Shiite idiosyncrasy), but each one of them has its own '*Sunnah.*' For saying this our *Tolu-e-Islam* organization was put in the melting pot and there was a pandemonium. It was decreed that we were non-believers of *Hadith*, disbelievers in his Great Holiness Messenger Muhammad[PBUH], that we were agnostics and heretics etc., etc. This propaganda against us was prolonged for a period of twenty years. On the other hand, the consequences remained the same. None of those hooters were able to pass any law, that could unanimously be agreed upon by these various sects. It was not possible then and neither has it become possible now. Finally Maulana Maudoodi had no choice left but to say:

> *"There is no such element in the 'Kitab aur Sunnah' (the Book and the Sunnah) that can resolve the legal issues of Hannafis, Shiites and Ahl e Hadith on a common basis." (Asia, August 23, 1970)*

It is hence obvious that, as long as Islam is divided in various sections, every section according to its own idiosyncrasies shall act upon the '*Sunnah.*' And as soon as you shall endeavour to unite these divided sections on a single platform, the *status quo* of '*Sunnah*' (according to the present definition of it) will be transformed.

HOW SHOULD WE FOLLOW MUHAMMAD[PBUH]?

The above moot brings us to a phase that is the core of our arguments. That it is the law of Allah – and He has reiterated in his command – to follow His Messenger. Whosoever follows the Messenger has indirectly followed Allah, and whosoever renounced the Messenger has reached the gates of hellfire. Again the same question occurs, that if we do not believe in the present *ahadith*, how is it possible to follow the life of the Messenger? This is the question, the most important and the basic one that is usually put forward; they prove it through Quran, that one ought to believe in the words and deeds of the Messenger and that *hadith* is the indispensible need of Islam. We do not have the slightest doubt that this question, is in fact very important, and that it does need our serious attention.

Before we attempt to answer the question, we think it is necessary to straighten its kink first. It is said:

I. According to the Holy Quran it is compulsory to follow the Messenger Muhammad.

II. And there are no other means apart from the *Hadith* books to follow the Messenger.

incidence is correct, though it was not performed in the capacity of a Messenger. The Maulana questions him again, as to what proof does he have and how can he be a judge as to the capacity of Muhammad[PBUH]. Maulana Maudoodi states that these matters are not qualified by authority or reason. These are decided by an individual who has an insight into Messenger's habits and temperament. Maulana Ismail answers:

> *"If a group of people, because of their obedient nature, decide to make one of its elderly members a Messengeric visionary and invest powers in him to annul or accept any hadith. We will, Inshallah, fight to the bitter end and defend the 'Sunnah' of the Messenger from such kinds of fluke attacks." (Jamaat e Islami ka Nazariya Hadith, page 63)*

What Maulana Maudoodi claims as '*Sunnah*' of the Messenger, the '*Ahl e Hadith*' sect calls it fluke attacks. And who also consider it their duty to defend the '*Sunnah*' from these type of attacks; until now we have discussed the views of Maulana Maudoodi and Maulana Ismail. Let us see another Maulana Islahi, who also has something to say on this issue:

> *"Hadith is every act, speech or deed that is referenced to the Messenger. Sunnah on the other hand is only that proven and known manner on which the Messenger has acted repeatedly, protected and to which he usually remained duty bound." (page 25)*

To which the late Maulana Ismail retorted and answered:

> *"Maulana (Islahi) has shrunk the definition of Sunnah so much that it is only concerned with a few actions, for example as the 'fundamentals' in the prayers. It must be repeated a thousand times that, 'if a person does not believe the 'Sunnah' to have been derived from 'Deen,' he must not be acknowledged as a Muslim.' The question is how are we to apply, a Sunnah that does not go beyond a few acts or deeds, to the whole of Islam. In that case then, Islam will have to be defined from somewhere else. Why decree on something that does not make sense?" (page 26)*

This was the definition of '*Sunnah*' (deeds of Messenger) about which the late Maulana Ismail said:

> *"In my opinion the ideas of Maulana Maudoodi and Maulana Islahi are not only against 'Ahl e Hadith,' in fact these ideas are against all hadith believers. The ideas carry the potential germs of modern justification." (page 110)*

From these above controversial reviews, the united stand of '*Book and Sunnah*' believers, it can be infered that they have yet to search for a common definition of '*Sunnah.*' What one sect considers a '*Sunnah,*' is thought as a division of Islam by another.

habit or a sunnah of the Messenger, that these actions can only be determined by those who have thoroughly understood the temperament or spirit of Islam....In the social and cultural issues there is a thing called ethical principles, for which the Messenger came to introduce them in the lives of the people. The other thing is the implementation factor of these principles that he himself adopted in his life. The implementation was based on his own temperament, while some were based on the traditions of the times he was born in and some on the ethos of the culture. None of these was meant to be applied on all people, all nations or all human beings as a 'Sunnah.'" (page 311, page 317)

He further writes in the same chapter:

"We find a few characteristics that are bonded to the Messenger's personal habits and social customs of those times. Those were not, according to the hadith literature, intended for 'Sunnah,' nor it is argued that these principles, of the social customs of a certain culture at a certain period in history, were sent to be applied to the whole of human kind for all times. If this definition of Sunnah is kept in mind, then it becomes very clear that those acts or deeds that do not come within the jurisprudence terminology, ought not to be forced as a 'Sunnah,' as this will be dividing the Deen." (page 314)

In short, according to the late Maulana Ismail, '*Sunnah*' is all and everything that is contained in the *ahadith*, and renouncing them is considered heresy. Whereas where Maulana Maudoodi is concerned, the actions, words and deeds of the Messenger performed in the capacity of a human being or as a habit, cannot be considered viable *hadith*. If anyone includes these acts also in the sphere of *hadith*, then he says:

"I am in the belief, that to call these acts and deeds the 'Sunnah' of the Messenger and insist on it is a conspiracy against Deen; it has had adverse effects in the past and shall prove dangerous in future also." (page 308)

Before this he wrote:

"To call those deeds, that he performed as a matter of habit and have them applied on all humankind, was not the intention of Allah and his Messenger. This is a bifurcation of Islam." (page 300)

In the light of the above excerpts, let us see a practical shape. There is an amendment in the Pakistan constitution, wherein is stated, that there shall be no law passed that goes against the '*Quran and Sunnah.*' Now a law is legislated and Maulana Ismail defies that law, as he considers it against the '*Sunnah*' and brings forth a *hadith* as his witness. Maulana Maudoodi confronts him and gives his verdict that it is not against the '*Sunnah.*' The former Maulana inquires whether the *hadith* that has been produced is authentic or not? Maulana Maudoodi argues that the *hadith*

THE STATUS OF HADITH...

THE ACTUAL STATUS OF HADITH:

Chapter I Continued

Translated By

Aboo B. Rana

****

WHAT IS SUNNAH

Besides *hadith* there is another term that is prevalent by the name of '*Sunnah.*' And this term impinges upon the finer sentiments of our being. 'Deen' it is said, 'is complying with the Sunnah of the Messenger.' You all must have heard these words buzzing everywhere. At the same time it will be amazing to know, that they have more than one opinion when it comes to defining this term called 'Sunnah.'

Several years from now, the president of *Jamiat e Ahl e Hadith*, the late Maulana Muhammad Ismail, published a magazine by the title, *"Jamaat e Islami ka Nazariya Hadith."* In that he had written a critique on Maulana Maudoodi's view of *hadith*. He explained that Maulana Maudoodi's views on *hadith* are close to a non-believer of *hadith*. So in his entries of *hadith* non-believers, the names of religious personalities included, besides others, were those of Sir Syed, Maulana Shibly, Maulana Hameed uddeen Farahi, Maulana Maudoodi and Maulana Ameem Ehson Islahi. Although he did not fire at them directly, he did say:

> *"These personalities are not disbelievers of Hadith. However, from their way of thinking, one sees a rebellious attitude towards hadith, that leaves the back doors open for non-believers."*

MAULANA MAUDOODI

The late Maulana Ismail also mentioned that '*Hadith*' and 'Sunnah' compliment each other. Meaning that *hadith* and *Sunnah* are one and the same. According to his belief, the terms 'Book and Sunnah' *(Kitab aur Sunnah)* means 'Quran and *Hadith*' *(Quran aur Hadith)*. And Maulana Maudoodi has his own interpretation of Sunnah. He narrates in his book *'Risayal aur Masayal'* volume 1, that:

> *"Sunnah are those actions and deeds for which God sent his Messenger to teach us in order to be implemented. The deeds that he performed in the capacity of a human being or those acts that he performed as a personality in history, are excluded from the Messenger's life. At times there have been deeds and actions that have become so indistinguishable whether it was a*

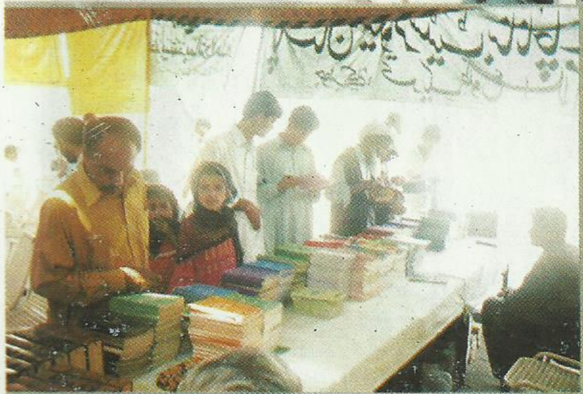

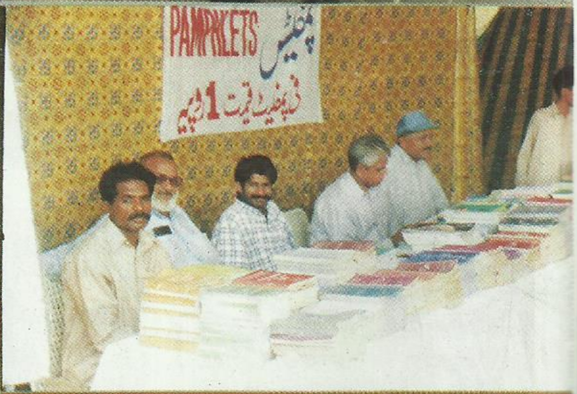
PAMPRLETS
پمفلٹس
فی پمفلٹ قیمت 1 روپیہ

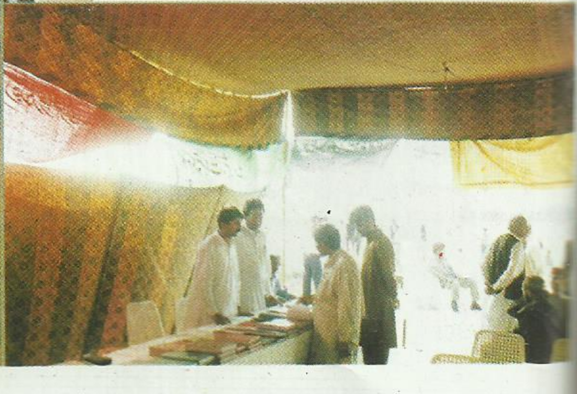

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL® AND QUAID-E-AZAM®

R.L.No. CPL-22
VOL:54
ISSUE 04

Monthly
TOLU-E-ISLAM
25-B, Gulberg 2, Lahore, PAKISTAN
Phone: 5714546, 5753666 Fax: 5866617
Email: idara@toluislam.com
Web Site: http://www.toluislam.com/

AMBER Range of Products:

Capacitors for Motor Start-Run, Fans, Blowers, Air Conditioners, Fluorescent Lamps, High Pressure/High Intensity Discharge Lamps, and, Power Factor Correction.

CUSTOMER SPECIFICATIONS ARE WELCOME!!

Amber Capacitors Limited
16-Link Mcleod Road, P. O. Box 468, Lahore, PAKISTAN.

Phone: +92 42 722 5865, 722 6975
Fax: +92 42 723 2807, 586 6617
Web Site: http://ambercaps.com/
Email: amber@ambercaps.com